بیگ صاحب

غریبوں اور کمزوروں کے مسیحا

بیگ صاحب

غریبوں اور کمزوروں کے مسیحا

مصنف
خالد انصاری

مترجم
ڈاکٹر محمد قمر تبریز

skyline
Publications Pvt. Ltd.

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

BEG SAHIB

A life dedicated to empowering the downtrodden

By: Khalid Ansari

نام کتاب:	بیگ صاحب: غریبوں اور کمزوروں کے مسیحا
مصنف:	خالد انصاری
مترجم:	ڈاکٹر محمد قمر تبریز
تعداد:	1000
قیمت:	-/250 روپے
اشاعت	2016
تزئین کار:	سہیل نقوی، بابر ایاز
السٹریشنز:	ایم ثاقب
آئی ایس بی این:	ISBN:978-81-932237-1-0
ناشر:	اسکائی پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ 167/7، سرائے جولینا، نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی۔110025
فون:	011-26914598,26924598,26934598
مطبع:	ڈی بی انسٹی ٹیوٹ آف گرافکس، نئی دہلی

فہرست عنوانات

پیش لفظ	7
سوانحی خاکہ	9
حیات اور شخصیت	10
مرزا فرید الحسن بیگ: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا	19
بچپن	39
زمانۂ تعلیم	42
مقصد حیات کی تلاش	45
وطن سے پہلے کچھ نہیں	49
کوآپریٹو موومنٹ: ایک جائزہ	53
ڈاکٹر ذاکر حسین کا نامکمل مشن	55
جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ	62
جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پیار	65
قوم کی فکر	69
رضا زکوۃ فاؤنڈیشن	74
اردو زبان سے لگاؤ	76
یادرہی گاؤں کی مٹی	78
گھریلو زندگی	85
انسانی رشتوں کی اہمیت	87
عورتوں کا احترام اور ان کی خودمختاری	91

شریک حیات	94
صفائی، خوش مزاجی اور اعلیٰ ذہنی	96
پیارے دادا/نانا	98
وراثت کے نگہبان	104
زندگی سے آخری جنگ	135
خصوصی نذرانہ	139
اعتراف و تشکر	141

جسٹس ایم ایس اے صدیقی

پیش لفظ

مرزا فرید الحسن بیگ ایک انسان دوست شخص تھے۔ ساتھ ہی وہ ایک ماہر تعلیم، کامیاب بینکر، اور ان سب سے اوپر ایک بہترین انسان بھی تھے۔ وہ اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ ملک کا تعلیمی نظام صرف امیروں اور دولت مند لوگوں کو نظر میں رکھ کر بنایا گیا ہے۔ غریب چاہ کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ ان اسکولوں یا کالجوں کی فیس برداشت کر سکیں۔ دوسری طرف، انھیں خود اپنی قوم کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اگر مسلمانوں نے اپنے آپ کو ماڈرن ایجوکیشن، انفارمیشن ٹکنالوجی اور نت نئی دریافتوں سے لیس نہیں کیا، تو ترقی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے کافی پیچھے رہ جائیں گے اور مستقبل میں پیدا ہونے والے سنہرے مواقع کو ہاتھ سے کھو دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے آبائی ضلع، اعظم گڑھ میں اُن بچوں کے لیے تعلیمی ادارے کھولے، جو غریبی، ظلم و استحصال اور مذہبی انتہا پسندی کی بنا پر جدید تعلیم

سے محروم تھے۔

سماج کے کمزور طبقوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے مرزا فرید الحسن بیگ نے ان کے اندر سماجی بیداری پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ اسی لیے ان کے ذہن میں مائکروفنانسنگ کا خیال آیا اور انھوں نے جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کی بنیاد ڈالی۔ یہ بینک اُن مظلوم اور بے سہارا لوگوں کے لیے امید کی کرن لے کر آیا، جو ناانصافی کی مار جھیل رہے تھے اور بے یار و مددگار زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ اُن کا ایک خواب تھا کہ ہمارے معاشرے کا سب سے کمزور یہ طبقہ، جو غریبی اور ناانصافی کی مار سے بدحال تھا، ایک دن امن، خوشحالی اور انصاف کا سرچشمہ بنے گا۔ انھوں نے جو راستہ چنا، وہ کانٹوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن مسلمانوں کے کردار اور ان کی ہمت کے عین موافق تھا۔ اس میں خود بیگ صاحب کے عزائم پوری قوت و توانائی کے ساتھ شامل تھے۔ لہٰذا، انھوں نے ہمارے لیے وہی چھوڑا، جس کا انھوں نے وعدہ کیا، پھر اس کو عملی جامہ پہنایا اور تاعمر اسی پر پابند عمل رہے۔

چلا گیا مگر اپنا نشان چھوڑ گیا
وہ عمر بھر کے لیے داستان چھوڑ گیا

جسٹس ایم ایس اے صدیقی
سابق چیئرمین، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات،
حکومت ہند

سوانحی خاکہ

نام	:	مرزا فرید الحسن بیگ
والد	:	مرزا رضا بیگ
والدہ	:	عمدہ خاتون
اہلیہ	:	نور جہاں
بھائی	:	مرزا احسان اللہ بیگ، مرزا صدر الدین بیگ، مرزا بدر الدین بیگ،
اولاد	:	مرزا شمس الحسن بیگ، نشاط بیگ، مرزا قمر الحسن بیگ، مرزا ظفر بیگ، مرزا احمر بیگ، صبا بیگ
ولادت	:	۱۰ جنوری ۱۹۳۶ء بمقام انجان شہید، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش
وفات	:	۶ مئی ۲۰۱۵ بمقام دہلی
وطن	:	انجان شہید، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش
مدفن	:	جامعہ نگر قبرستان، نئی دہلی
ابتدائی تعلیم	:	مدرسہ اسلامیہ پاٹھ شالہ، انجان شہید گاؤں
		گاندھی ہائی اسکول، مالٹاری اعظم گڑھ، شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ،
اعلیٰ تعلیم	:	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
ملازمت	:	اتالیق، جامعہ مڈل اسکول، دہلی ایڈمنسٹریشن

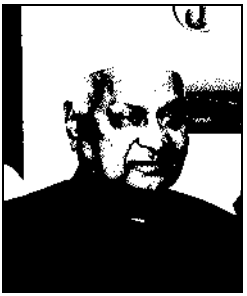

حیات اور شخصیت

کسی کو ہو نہ سکا اس کے قد کا اندازہ
وہ آسماں تھا، مگر سر جھکائے رہتا تھا

بعض افراد صرف ذاتی فائدے کو ہی کامیابی سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کی غرض صرف اور صرف اپنے نفع ونقصان سے ہوتی ہے، لیکن کچھ ایسی شخصیات ہوتی ہیں جو قوم و ملک کے مفاد کو اپنا مقصد حیات سمجھتی ہیں۔

مرزا فرید الحسن بیگ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔غریبوں کے دکھ درد کو دیکھ کر وہ پریشان ہو جایا کرتے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی کہ کیسے اِن معصوموں کے چہروں پر مسکان لائی جائے۔

مرزا فرید الحسن بیگ کی پیدائش 10 جنوری، 1936 کو اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں انجان شہید میں ہوئی۔آپ کے والد مرزا رضا بیگ اور والدہ عمدہ خاتون گھر پر آپ کو پیار سے

'مٹھو' کہہ کر پکارتے۔ پانچ سال کی ننھی سی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، لیکن بڑے بھائی مرزا احسان اللہ بیگ نے غم کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے 'مٹھو' کی تعلیم کا اچھا انتظام کیا اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دی۔

گاؤں کے ہی مدرسہ اسلامیہ پرائمری پاٹھ شالہ میں مٹھو کا نام لکھا دیا گیا، جہاں سے انہوں نے پرائمری اسکول کی پڑھائی مکمل کی۔ اس کے بعد ان کا داخلہ اعظم گڑھ کے گاندھی ہائی اسکول، مالٹاری میں کرا دیا گیا، جہاں سے انھوں نے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔ مٹھو اس اسکول کے پہلے بیچ کے طلبہ میں سے ایک تھے۔

گاندھی ہائی اسکول مرزا احسن اللہ بیگ کے ذہن کی پیداوار تھا۔ انھوں نے اس اسکول کا خاکہ تیار کرنے سے لے کر اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرنے تک میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔

گاندھی ہائی اسکول، مالٹاری سے میٹری کولیشن کرنے کے بعد 'مٹھو' نے شبلی انٹر کالج، اعظم گڑھ میں داخلہ لے لیا، جہاں پر انھوں نے بارہویں کلاس تک کی تعلیم مکمل کی۔

بچپن میں مٹھو اکثر اپنی ماں کو غریبوں اور یتیموں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا کرتے۔ انھوں نے ذات پات اور مذہب و مسلک کی تمام دیواروں کو توڑتے ہوئے اپنے آس پاس کے درجن بھر یتیم بچوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ ان بچوں کا تعلق بنیادی طور پر دلت کنبوں سے تھا، جن کے ماں باپ وبائی امراض (مہاماری) پھیلنے کی وجہ سے اپنی جان نہیں بچا پائے اور اپنے پیچھے اِن بچوں کو روتا ہوا چھوڑ گئے۔

مرزا فرید الحسن بیگ اپنے والد کو بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا کرتے، جو غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے ہمیشہ جی توڑ محنت کرتے۔

بچپن میں ماں باپ کے ان کارناموں کا اثر مٹھو پر اتنا ہوا کہ وہ خود زندگی بھر غریبوں کے لیے بے چین رہے۔ وہ ہمیشہ اسی سوچ میں ڈوبے رہتے کہ کیسے سماج کے دبے کچلے اور غریبی کی مار جھیل رہے لوگوں کو خوشحال بنایا جائے، انھیں سر اٹھا کر جینا سکھایا جائے۔

ایک دن شبلی انٹر کالج کے اساتذہ نے طلبہ کو ایک ڈاکیومینٹری دکھانے کا انتظام کیا۔ 'ہندوستان

میں اقلیتیں' نام کی اِس ڈاکیومینٹری میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، اقلیتوں کے لیے اُن کا وژن اور مسلمانوں کی مجموعی ترقی میں تعلیم کے رول کو بہتر انداز میں دکھایا گیا۔

ڈاکیومینٹری دیکھنے کے بعد مٹھو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اُن کی اس بے چینی میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔

مٹھو جس سال اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے والے تھے، انھیں دنوں اپنے بڑے بھائی مرزا احسن اللہ بیگ کو انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بھائی سے درخواست کی کہ وہ انھیں دہلی بھیجنے کا انتظام کریں۔

مرزا احسان اللہ بیگ کو اپنے چھوٹے بھائی کی اس بڑی خواہش کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، کیوں کہ وہ خود بھی ایک سماجی کارکن، ماہر تعلیم اور انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے شخص تھے۔ مٹھو کو دہلی بھیجنے کے لیے انہوں نے سارے انتظامات کیے۔ یہی نہیں، مٹھو کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے انہوں نے اُس وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ سی بی گپتا سے جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب کے نام ایک خط بھی لکھوایا۔

اب تک مٹھو کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ سماج میں انقلاب لانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا، اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے، جس کی وکالت پنڈت جواہر لعل نہرو کرتے تھے۔ دوسرا، ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو طریقہ اپنایا تھا کہ ایجوکیشن، مالی مدد اور سماجی کاموں کے ذریعے غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔

انھوں نے کوآپریٹو موومنٹ اور سوشل ورک کا گہرائی سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف جہاں وہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے انہیں ایک مالی ادارہ کی ضرورت ہے، وہیں انہیں بڑے دل والے ایسے لوگوں کی بھی تلاش تھی، جو غریبوں کو خوشحال بنانے میں ان کی مدد کر سکیں۔

ان کی پہلی کوشش یہی تھی کہ کیسے لوگوں کو ہنرمند اور اس لائق بنایا جائے کہ وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے خود اپنے وسائل کا استعمال کریں۔ مرزا فرید الحسن بیگ 1958 میں دہلی تشریف

لائے۔ یہاں آ کر انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور 'سوشل ورک' کی پڑھائی شروع کر دی۔

حسب معمول وقت گزرتا رہا۔ ایک شام، جامعہ نگر کے تکونا پارک میں جب وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ، ملک کی تعمیر میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا رول اور تعلیم کے ذریعہ اقلیتوں کو با اختیار بنانے پر بحث کر رہے تھے کہ کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''خاکسار کو ذاکر حسین کہتے ہیں۔''

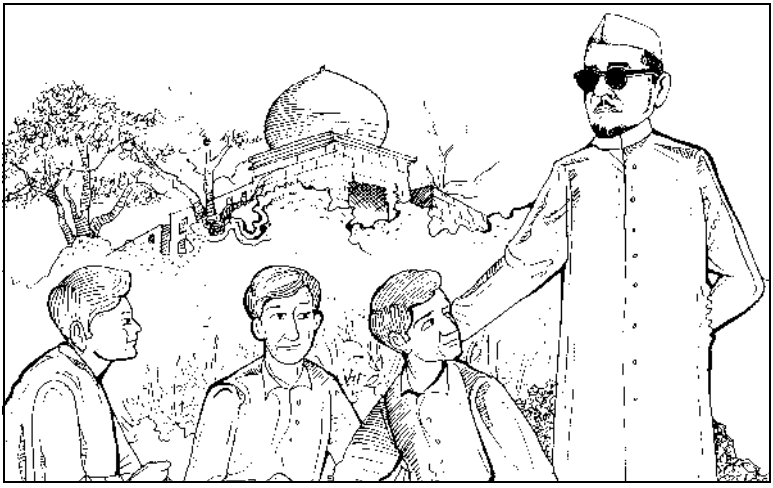

مرزا فرید الحسن بیگ نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ اتنے حیران ہوئے کہ منھ سے فوراً کچھ نکل نہ سکا۔ یہ وہی ذاکر حسین تھے، جن کی شخصیت، کارناموں اور سوچ سے مٹھو سب سے زیادہ متاثر تھے۔

اس ملاقات کے بعد مرزا فرید الحسن بیگ ڈاکٹر ذاکر حسین کے رابطے میں بنے رہے اور گزرتے وقت کے ساتھ دونوں کے آپسی تعلقات بھی مضبوط ہوتے گئے۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوست کو دل کی یہ بات بتا دی کہ ''مجھ میں لیاقت نہیں ہے، لیکن غریبوں کے لیے کچھ بڑا کرنا چاہتا ہوں۔'' دوست نے جواب دیا، ''اگر لیاقت نہیں ہے تو خدمت کا جذبہ پیدا کر لو، کامیابی قدم چومے گی۔''

اِن الفاظ نے نوجوان مرزا فرید الحسن بیگ کی زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ وہ ہر وقت ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس قیمتی مشورے کے بارے میں سوچتے رہتے۔ کبھی کبھی تو اتنی گہری سوچ میں پڑ جاتے کہ انہیں اپنے آس پاس کا کچھ خیال ہی نہ رہتا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'سوشل ورک' کی پڑھائی کے دوران، مرزا فرید الحسن بیگ نے بہت اچھے دوست بنائے۔ انھیں دنوں اُن کی جان پہچان دہلی کے مشہور لوگوں سے بھی ہوئی، جن میں سماجی کارکن سے لے کر تعلیم کے ماہر، نوکر شاہ اور سیاسی لیڈر تک شامل تھے۔ ایک بار یونیورسٹی کے سوشل ورک ڈِپارٹمنٹ کے سینئر استاد جناب مدن لال شرما نے فرطِ محبت سے کہا کہ ''ایک دن میرا مرزا بڑے بڑے کام کرے گا۔'' مدن لال شرما اپنے ہونہار شاگرد مرزا فرید الحسن بیگ سے بے انتہا محبت کرتے اور انھیں زندگی میں بڑے کام کے لیے تیار کرنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔

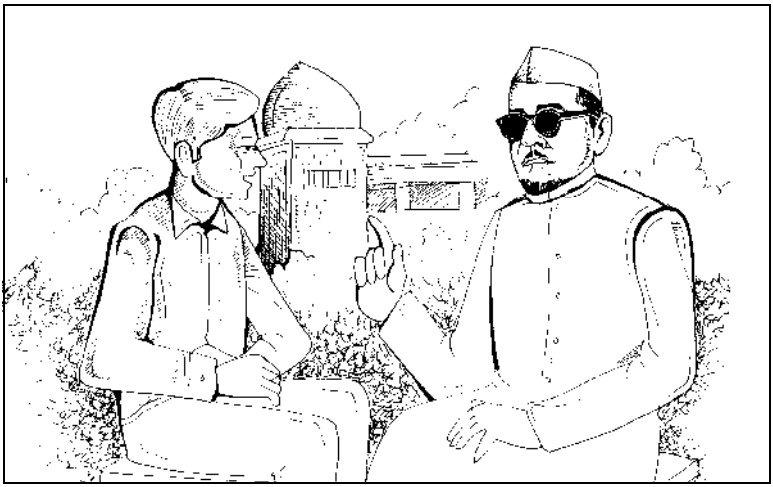

ہاتھ میں سوشل وَرک کی ڈگری اور دل میں دبے کچلے لوگوں کی زندگیوں کو بدلنے کا جذبہ لیے ہوئے مرزا فرید الحسن بیگ میدانِ عمل میں کود پڑے۔ انہوں نے جامعہ علاقہ کے غریب لوگوں سے ملنا اور مختلف مقامات پر بنے کیمپوں کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔

بیگ صاحب نے چونکہ جامعہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اپنے سماجی کام کے لیے چنا تھا، اس لیے انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اتالیق (استاد) کی نوکری حاصل کر لی۔ انہوں نے

'ایک آدمی، دو مشن' کا فارمولہ اپناتے ہوئے، اپنے بچے ہوئے وقت کو کمزور لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے میں لگانا شروع کر دیا۔

کونسلر چودھری نارائن سنگھ کی مدد سے انہوں نے پوری توجہ اپنے علاقے میں بجلی، پانی، صاف صفائی اور طبی خدمات جیسی بنیادی سہولیات پہنچانے میں لگائی۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے بھی ہوئی، جو پڑھنے پڑھانے کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، چھوٹی ذہنیت والے ہیں اور اپنی برادری کے لوگوں کے ساتھ ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

بیگ صاحب نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر انھیں ایک بہتر اور خوشحال مستقبل چاہیے، تو انھیں اپنی آبادی سے باہر نکلنا ہوگا اور دوسری برادریوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

تبھی، ان کے ذہن میں معیاری زندگی کی تمام سہولیات سے لیس ایک ریگولرائزڈ کالونی بنانے کا خیال آیا۔ اس کے لیے بیگ صاحب نے اپنے تمام قریبی دوستوں کو تیار کیا، ان کے ساتھ اس موضوع پر بات کی اور اپنے ایک قریبی دوست، انجینئر احمد سعید سے کہا کہ وہ کچھ اور لوگوں کو جمع کریں، جو ایسی ہی سوچ والے ہوں اور جو خود بھی ایسی کالونی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

اس کے بعد سوسائٹی نے جنوبی دہلی میں زمین الاٹ کرانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس سلسلے میں ماہر تعلیم سید حامد، جو اُن دنوں وزارتِ داخلہ میں جوائنٹ سکریٹری تھے، انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر مدد کی۔ آخر کار، اِن لوگوں کی آپسی کوششیں رنگ لائیں اور اس طرح نیو فرینڈز کالونی کے سامنے 4.25 ایکڑ کا ایک خطہ اراضی انھیں الاٹ کر دیا گیا۔

کام کی ترتیب اور نگرانی کے لیے بیگ صاحب نے معروف آرکی ٹیکٹ، راج ریوال کو چنا، جو فن تعمیر اور ٹکنالوجی کے میل جول سے خوبصورت عمارتیں بنانے کے لیے مشہور تھے۔

راج ریوال کے ذریعے چار کروڑ کی لاگت سے بننے والی اور 204 مکانوں والی یہ خوبصورت کالونی 1984 میں بن کر تیار ہوگئی۔ چونکہ اس رہائشی پروجیکٹ کا خاکہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت سے متاثر ہو کر تیار کیا گیا تھا، لہٰذا ممبران نے انھیں نذرانہ پیش کرتے ہوئے اس کا نام 'ذاکر باغ'

رکھا۔ایک ایسے باغ کی طرح، جس میں طرح طرح کے پیڑ پودے لگے ہوں، ذاکر باغ میں بھی طرح طرح کے لوگوں کو بسایا گیا، جن میں چپراسی، کلرک، ماہرین تعلیم سے لے کر، انجینئر، نوکر شاہ، وکیل، ڈاکٹر اور تاجر، سبھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ بیگ صاحب نے ایک اور قدم آگے بڑھتے ہوئے یہاں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی لا کر بسایا، تاکہ یہ انسانی باغ ہر قسم کے تہذیبی و ثقافتی رنگوں کی ایک عمدہ مثال ثابت ہو سکے۔ یہ بیگ صاحب کی بڑی کامیابیوں میں سے ایک تھی۔

رہائش کے مسئلہ سے بے فکر ہونے کے بعد، اب بیگ صاحب سماجی خدمت کے اپنے بنیادی کام پر لگنا چاہتے تھے، غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ جامعہ کوآپریٹو بینک کے نام سے انہوں نے دوسرا پروجیکٹ شروع کیا، جس کا مقصد غریبوں کے لیے پیسے کا انتظام کرنا تھا۔

مرزا صاحب نے اس پروجیکٹ کے بارے میں اُس وقت کے تمام سرکردہ ماہرین سے بات چیت کی، ایک عملی نقشہ تیار کیا اور کاغذی کام ماہر اقتصادیات راجا چیلیا کے ساتھ مل کر کیا، جو کہ رجسٹریشن کے وقت اس کے پہلے چیئرمین تھے۔ کچھ دنوں بعد، چیلیا کی جگہ آئی زیڈ بھٹی نے لے لی، جنھوں نے بینک کے دوسرے چیئرمین کے طور پر عہدہ سنبھالا۔

آخر کار، تمام پریشانیوں پر قابو پاتے ہوئے، جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ (جے سی بی) نے 1995 سے کام کرنا شروع کر دیا۔ آج پورے فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جے سی بی بہترین کوآپریٹو بینکوں میں سے ایک ہے۔ اس کے پاس 152 کروڑ کا ڈِپوزٹ بزنس اور 84 کروڑ کی اضافی رقم موجود ہے۔

آج اگر ہم جے سی بی کی حصولیابیوں پر نظر ڈالیں، تو اس نے ایسے بے انتہا لوگوں کو قرض دیے ہیں، جو اپنی دو وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اسی طرح جامعہ کوآپریٹو بینک نے ان لوگوں کو قرض دیا، جو چھوٹا موٹا کوئی کاروبار شروع کر کے اپنی زندگی کو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ عورتوں کو بااختیار بنانے اور اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے انھیں ہنرمند بنایا، انھیں گاڑیاں خریدنے کے لیے قرض دلوائے، تاکہ ان کی زندگیاں بھی بدلیں اور وہ خوشحالی کی زندگی جی

سکیں۔

لوگوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے آسان شرطوں پر قرض مہیا کرانے کے علاوہ، جے سی بی نے پڑھنے والے بہت سے بچوں کو اپنی تعلیم جاری رکھنے اور اپنی فیملی کا مقدر بدلنے میں بھی ان کی مدد کی۔ مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنے دوست انجینئر احمد سعید سے یہ بات کہی تھی کہ ''کسی بھی بچے کو صرف اس لیے تعلیم سے دور نہ رکھا جائے کہ اس کے ماں باپ پڑھائی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے۔ اسے تعلیم یافتہ بنانا اُن لوگوں کی ذمہ داری ہے، جنہیں خدا نے ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے مالا مال کیا ہے۔ ہمارے سماج کو آگے بڑھ کر تعلیم کے میدان میں مدد کرنے کی ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے۔''

بیگ صاحب دارالحکومت دہلی میں دبے کچلے لوگوں کو غریبی کے اندھیرے سے باہر نکالنے میں تو لگے ہوئے تھے ہی، اسی درمیان انہوں نے اپنے آبائی وطن انجان شہید، اعظم گڑھ، اتر پردیش میں بھی کئی تعلیمی پروجیکٹ شروع کیے۔

انھیں تعلیمی پروجیکٹوں میں سے ایک مرزا احسن اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج بھی تھا، جسے مرزا فرید الحسن بیگ نے مرزا محفوظ بیگ، مرزا عارف بیگ اور مرزا قمر الحسن بیگ کے ساتھ مل کر اپنے بڑے بھائی مرزا احسن اللہ بیگ کی یاد میں بنوایا تھا۔ اسے قائم کرنے میں انھیں فیملی کے دیگر اراکین سے بھی تعاون حاصل ہوا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد 18 فروری، 2003 کو ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور جامعہ ہمدرد کے سابق چانسلر مرحوم سید حامد نے رکھا تھا۔

لوگوں کو مالی طور پر اور تعلیمی اعتبار سے با اختیار بنانے کی ان تمام کوششوں کے درمیان، مرزا فرید الحسن بیگ نے ایک ایسا میکانزم تیار کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی، جہاں اعظم گڑھ کے لوگ اپنے مسائل و خدشات سے متعلق بات کر سکیں۔ پھر، ان کی یہ باتیں وہاں سے انتظامیہ تک پہنچائی جائیں، تاکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کا کوئی حل نکال سکیں اور اعظم گڑھ کے عوام سرکاری سہولیات کا فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کا نتیجہ ہمیں 'وائس آف اعظم گڑھ' (وی او اے) کے نام سے ایک کمیونٹی ریڈیو کی شکل میں دیکھنے کو ملا۔ وائس آف اعظم گڑھ کی پروگرام ہیڈ، سیما شریواستو کے مطابق، ''ہم ایسے پروگرام

چلاتے ہیں، جن سے متاثر ہوکر لوگ اپنی زندگی میں کچھ بڑا کر سکیں۔ سرکاری افسروں کو اس علاقہ کے لوگوں سے جوڑتے ہیں، تاکہ وہ فلاحی اسکیموں کے بارے میں انھیں بتا سکیں۔ غریبوں کو ایک کھلا پلیٹ فارم عطا کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنے مسائل وخدشات کو ظاہر کر سکیں، یہاں سے اپنی آواز بلند کر سکیں۔''

سال 2015 کے ابتدائی ایام میں مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنے صاحبزادوں کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دہلی میں بھی انگلش میڈیم اسکول کھولنا چاہتے ہیں۔ اپنے والد کی اِس آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے ان کے لائق بیٹوں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔

6 مئی، 2015 کو دل کا دورہ پڑنے سے وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ شاید اِس دنیا سے زیادہ کسی اور دنیا میں اُن کی ضرورت تھی۔ یہاں کے لوگ اب بھی اُن کی سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بیگ صاحب نے غریبوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی گھڑی، انگوٹھی، کپڑے اور جوتے وغیرہ تک بیچ ڈالے تھے۔

7 مئی، 2015 کی دوپہر کو ان کی رہائش گاہ ایشور نگر نزد ذاکر باغ سے میت کو جنازے کی نماز کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں لایا گیا۔ حضرت سید بلال تھانوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی، ہزاروں افراد نے جنازے کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد میت کو جامعہ قبرستان لایا گیا۔ ان کی آخری آرامگاہ کے لیے یہ جگہ اس لیے بھی صحیح تھی، کیوں کہ یہیں سے انہوں نے اپنے مشن کی شروعات کی تھی۔

اب، جب کہ مرزا فرید الحسن بیگ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن انسانوں کی خدمات اور لوگوں سے اچھا سلوک جیسے ان کے کارنامے نہ صرف انہیں سب کے دلوں میں زندہ رکھیں گے بلکہ ان کے مشن کو بھی آگے بڑھاتے رہیں گے۔

مرزا فرید الحسن بیگ

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

مرزا فرید الحسن بیگ کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے جاننا اُن لوگوں کے لیے بھی گہری تحقیق اور تجسس کی بات ہے، جو انجان شہید، اعظم گڑھ میں بچپن سے ہی اُن کو 'مٹھو' کے طور پر جانتے تھے اور اُن کے لیے بھی، جو جامعہ نگر، نئی دہلی میں پہلی بار ان سے ملے۔

اُن کی بے لوث سماجی خدمات، خاص کر لڑکیوں کو بااختیار بنانے میں انھوں نے جو کچھ کیا، اسے دیکھ کر اُن کے بچپن کے گہرے دوست حیران تھے کہ کیسے تعلیم کے سہارے بیگ صاحب نے اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ دوسری طرف، جامعہ کے دنوں کے ان کے بہترین دوست اس بات کے گواہ بنے کہ کیسے مرزا فرید الحسن بیگ ان کے مسائل اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بیگ صاحب نے کیسے ذاکر باغ اور جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ قائم کر کے اُن کی رہائشی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کا کام کیا۔

بیگ صاحب کی زندگی کے تمام واقعات کو ایک ساتھ جمع کرنے پر ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مرزا فرید الحسن بیگ بلاشبہ اُن لوگوں کے لیے 'خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی نعمت' تھے، جنھوں نے شاید اپنی مشکلوں اور پریشانیوں کے وقت میں اُن جیسے انسان کو اِس دنیا میں بھیجنے کی دعا کی ہوگی۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کیوں وہ ایک فراخ دل رکھتے تھے اور ان کے دل میں بے شمار لوگوں کے لیے رحم، محبت اور فلاح کا جذبہ کیوں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آخری سانس لیتے وقت بھی وہ اسی تجسس میں مبتلا دیکھے گئے کہ انھوں نے سماج کے غریب افراد کی فلاح و بہبود کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں، اُن کی حالت کیا ہے اور وہ ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں یا نہیں۔

مشہور وکیل اور جسٹس ایس این کمار کی اہلیہ، محترمہ ارچنا کمار کہتی ہیں، ''ہمارے درمیان رشتہ تقریباً 35 سال پہلے پیشہ کی بنیاد پر بنا، لیکن جلد ہی ہم ایک فیملی بن گئے۔ میں نے مرزا فرید الحسن بیگ کے بارے میں محسوس کیا کہ وہ کریم النفسی، عاجزی، دیانت داری اور مہمان نوازی کا سرچشمہ تھے۔ وہ میرے دونوں بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ میرے گھر پر اکثر تشریف لاتے اور میرے بچوں کے لیے ہمیشہ لذیذ کھانا لے کر آتے۔ میرے گھر پر چاہے میری بیٹی کا یومِ پیدائش ہو یا کوئی اور سماجی تقریب، وہ ہر موقع پر ہمارے ساتھ ہوتے۔''

قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، حکومت ہند کے سابق چیئرمین، جسٹس ایم ایس اے صدیقی کے مطابق، مرزا فرید الحسن بیگ اپنے کردار و عمل کے حساب سے ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ جسٹس صدیقی بتاتے ہیں کہ ''میں نے اپنی زندگی میں ایسا انسان کبھی نہیں دیکھا، جس کا واحد مقصد غریبوں کو اُن کی بدحالی سے باہر نکالنا رہا ہو اور جس نے اپنی پوری توانائی اور سارے وسائل اسی کام میں لگا دیے ہوں۔ وہ زندگی بھر یہی جدوجہد کرتے رہے کہ کیسے ضرورت مند لوگوں کو اُن کے پیروں پر کھڑا کیا جائے، تاکہ وہ بھی سر اُٹھا کے زندگی گزار سکیں۔''

انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر، نئی دہلی کے صدر، سراج الدین قریشی بتاتے ہیں، ''بیگ صاحب سے میرا تعارف تقریباً تین دہائی پہلے جسٹس ایس این کمار اور محترمہ ارچنا کمار نے کروایا تھا۔ وہ ایک

شریف انسان اور متعدد خوبیوں کے مالک تھے، جس سے میں کافی متاثر ہوا۔ میں بیگ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے جامعہ کوآپریٹو بینک کے ڈائرکٹر کے عہدہ کی پیش کش کی، جسے میں نے بخوشی قبول کرلیا۔ مجھے اعظم گڑھ میں ان کے ہوم ٹاؤن انجان شہید کا دورہ کرنے اور وہاں 18 فروری، 2012 کو مرزا احسن اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج کے کامرس ڈپارٹمنٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا بھی موقع ملا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے بچے بیگ صاحب کی وراثت کو آگے لے کر جائیں۔''

اردو کے معروف شاعر، اقبال اشہر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''میری نظر میں مرزا صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کے لیے مالی ادارہ قائم کرنا تھا، خاص کر ایسے وقت میں، جب اس قسم کی زیادہ تر کوششیں یا تو ناکام ہوگئیں یا پھر انھوں نے غریبوں کو چھوڑ کر امیروں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ جامعہ نگر میں رہنے والے کمزور طبقوں کی سدھ لینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مالی اداروں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جامعہ نگر 'نگیٹو زون' ہے۔ مرزا صاحب نے جس جامعہ کوآپریٹو بینک کی بنیاد ڈالی، وہ صرف ایک بینک ہی نہیں ہے، بلکہ اُن لاکھوں بے سہارا کنبوں کی لائف لائن (شہ رگ) ہے، جو غریبی کی وجہ سے اپنے بچوں کو پڑھانے، اپنا کوئی کاروبار شروع کر کے اقتصادی طور پر بااختیار بننے یا پھر غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے بینک سے قرض لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

خود اقبال اشہر کو ایک بار دل کا دورہ پڑا، جس کی وجہ سے ان کی حالت کافی نازک ہوگئی۔ ایسے میں مرزا صاحب نے اُن کی زندگی بچانے میں مثالی رول ادا کیا۔ اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے اقبال اشہر کہتے ہیں، ''ایک بار مجھے دل کا دورہ پڑا۔ اُس وقت میری جان بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں مرزا صاحب ہی تھے، جنھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے میرے علاج کا بہتر سے بہتر انتظام کریں۔ انھوں نے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ 'میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سے ایک اقبال اشہر بھی ہے۔ ان کے بہترین علاج اور ہر اُس چیز کا انتظام کرو، جن کی انھیں ضرورت ہے۔' مجھے ایسکارٹ ہاسپٹل میں بھرتی کرایا گیا، جہاں میری اوپن ہارٹ سرجری ہوئی اور جب تک میں پوری طرح صحت یاب نہیں ہوگیا، تب تک ان کے بیٹوں نے میرا پورا خیال رکھا۔

طبیعت بحال ہونے کے بعد میں اُن کا شکریہ ادا کرنے ان کے گھر گیا۔ ملاقات کے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، 'اقبال، آپ تو بس اردو ادب کی خدمت کرتے رہیے، باقی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے لیے ہم ہیں۔' میری صحت کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد انھوں نے چپکے سے مجھے کچھ پیسے دیے اور کہا، 'اِس پیسے سے کچھ پھل کھا لینا۔' میں اُن کے جذبہ ہمدردی کو سلام کرتا ہوں، جس کی وجہ سے مجھے ایک نئی زندگی ملی۔ اگر اللہ نے اُن کو میرے پاس نہیں بھیجا ہوتا، تو شاید میں بچ نہیں پاتا اور کسی قبر میں سو رہا ہوتا۔''

سینئر سیاسی کارکن اتل کمار انجان کے مطابق، مرزا صاحب نے ایک ہندوستانی اور ایک سچے مسلمان کے طور پر زندگی گزاری۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''اگر اس ملک کے شہریوں میں سے کسی نے ہندوستانی آئین پر پابندی سے عمل کیا ہے، تو میرے خیال سے مرزا فرید الحسن بیگ اس کی انوکھی مثال ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی آئین کے مطابق گزاری۔ انھوں نے ایک ہندوستانی اور ایک سچے مسلمان کا کردار پیش کیا۔ ان کا دل پیار و محبت، قربانی اور حب الوطنی کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے عمل کر کے دکھا دیا کہ ایمانداری کسے کہتے ہیں۔ بغیر کسی دھوکہ یا فریب اور غلط کام کے انھوں نے ترقی کی تمام منزلیں طے کیں۔''

اتل کمار انجان نے مزید بتایا کہ ''وہ ایک مذہبی انسان تھے، لیکن قدامت پرست بالکل نہیں تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتے وقت انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ فلاں کا مذہب کیا ہے۔ ان کا دل انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار تھا۔ وہ ہر کسی مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے ضرورت مند کی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ محدود وسائل کے سہارے انھوں نے جامعہ سے اپنی تعلیم مکمل کی اور یہاں بہت سارے دوست بنائے۔ حالانکہ وہ دہلی اس لیے آئے تھے، تاکہ یہاں اپنی تعلیم مکمل کریں اور پھر اپنے آبائی وطن واپس لوٹ جائیں۔ لیکن، اخیر میں انھوں نے یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ اس شہر نے انھیں اپنے سماجی کاموں کو مؤثر انداز سے انجام دینے کے بہترین مواقع فراہم کیے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دہلی وہ جگہ ہے، جہاں ان کے رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین رہا کرتے تھے۔''

بقول شاہد صدیقی (ایڈیٹر نئی دنیا اور سابق رکن پارلیمنٹ)، مرزا فرید الحسن بیگ مسلمانوں کے لیے ایک رول ماڈل تھے۔ ''ملک کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ دہلی آئے اور یہیں بس گئے۔ بیگ صاحب بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔ لیکن ساتھ ہی، وہ اُن لوگوں میں سے بھی ایک ہیں، جنھوں نے دہلی سے کچھ لیا نہیں ہے، بلکہ اسے دیا ہے۔ حکیم عبدالحمید کے بعد بیگ صاحب ایسے دوسرے شخص ہیں، جنھوں نے تعلیم کے میدان میں کافی کام کیا ہے۔ بہت سے لوگ باتیں تو بڑی بڑی کرتے ہیں، لیکن عملی میدان میں ان کا کارنامہ صفر ہے۔ بیگ صاحب نے جامعہ کوآپریٹو بینک قائم کر کے اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک بڑا کام کیا ہے۔

''وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے بچوں کو ماڈرن ٹکنالوجی کے مطابق تعلیم دلوائیں۔ اسی لیے وہ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور معیاری انگلش میڈیم اسکول کھولنے کے لیے فکرمند رہتے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ تلوار کا زمانہ چلا گیا۔ آج مسلمان صرف تعلیم کے ذریعہ اپنی لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ چیونٹی جس طرح خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے، اسی طرح وہ بھی لوگوں کی بہتری کے لیے عمر بھر کام کرتے رہے۔ اس سوچ اور رفتار سے کام کرنے والے اگر کچھ اور لوگ ان کے ساتھ جڑ جاتے، تو وہ ایک بڑا انقلاب برپا کر سکتے تھے۔''

مرزا صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اسد علی فرماتے ہیں، ''اپنی مثبت سوچ کو عملی جامہ پہنا دینا مرزا فرید الحسن بیگ کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ ذاکر باغ ہو یا جامعہ کوآپریٹو بینک، یا پھر اعظم گڑھ میں اسکولوں کی تعمیر، مرزا صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو سوچ تو بڑی اچھی اچھی رکھتے ہیں، لیکن انھیں حقیقت کا روپ نہیں دے پاتے۔ اس کے برعکس بیگ صاحب نے جو سوچا، وہ کر کے دکھایا۔ بیگ صاحب اس بات کو بھی بخوبی جانتے تھے کہ کس کام کے لیے کس افسر سے رابطہ کرنا ہے۔ اگر انھیں سرکاری دفتر سے کوئی کام کرانا ہوتا، تو سب سے پہلے وہ اُس دفتر میں جا کر وہاں کے کلرک سے دوستی کرتے، تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ متعلقہ افسر سے ملنے سے پہلے کیا کیا کام کرنے ہیں۔''

مرزا صاحب سے اپنی دوسری ملاقات کو یاد کرتے ہوئے کنور اجے کمار سنگھ اس واقعہ کا ذکر ان

الفاظ میں کرتے ہیں، ''شری کملاپتی ترپاٹھی کے مشورہ پر 1978 میں جب میرے والد مرزا احسان اللہ بیگ کے ساتھ شریمتی اندرا گاندھی سے ملنے کے لیے دہلی آئے، تو اُن کے ساتھ میں بھی یہاں آیا۔ دہلی میں انھوں نے مٹھو چاچا کے گھر پر بٹلہ ہاؤس میں قیام کیا۔ میں یہاں تقریباً سات دن تک رُکا۔ میں نے دیکھا کہ مٹھو چاچا (مرزا فرید الحسن بیگ) صبح پانچ بجے سو کر اٹھ جاتے اور خود اپنے ہاتھوں سے گرما گرم چائے میرے لیے بنا کر لاتے۔ واپسی پر میں نے اپنی ماں سے کہا کہ مٹھو چاچا بہت اچھے انسان ہیں۔ انھوں نے میری تعلیم کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ اعظم گڑھ میں کیا کچھ چل رہا ہے اور یہ کہ غریبوں اور پس ماندہ لوگوں کی بہتری کے لیے کیسے کام کیا جائے۔ میں اُن کے عزم و حوصلہ سے کافی متاثر ہوا، حالانکہ اس وقت چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں ان چیزوں کو بہتر ڈھنگ سے نہیں سمجھ پاتا تھا۔ اس کے بعد سے ہی میں انھیں کافی پسند کرنے لگا۔ وہ جب بھی میرے گھر آتے، میرے والد صاحب اُن کو 'مٹھو' کہہ کر پکارتے۔ یہ سن کر میں ہنس پڑتا، کیوں کہ تب مجھے وہ منظر یاد آ جاتا، جب والد صاحب کے پکارنے پر میں نے پردے کے پیچھے سے پہلی بار مٹھو چاچا کو دیکھا تھا، کیوں کہ ہمارے یہاں عام طور پر 'مٹھو' لفظ طوطے کو پکارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن میں نے پہلی بار دیکھا کہ یہ لفظ کسی انسان کو بلانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کی ایمانداری اور تعلیم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں ان کی لگن اور محنت کے اعزاز میں انھیں 18 فروری، 2005 کو پہلے فرینڈ شپ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شری رام کنور سنگھ کے 'جنم شتابدی ساروہ' کے موقع پر یہ ایوارڈ اُن بے داغ اور محرک شخصیات کو دیا جاتا ہے، جنھوں نے تعلیم کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہو۔

کنور اجے کمار سنگھ نے مزید بتایا کہ ''جب میں نے مرزا صاحب کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی، تو میرے خیال سے مجھے وہ ایک فقیر (درویش) دکھائی دیے۔ پس ماندہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی اُن کی جو سوچ تھی، میں اس کی دل کی گہرائیوں سے تعریف کرتا ہوں۔ کسانوں کو ظلم و استبداد سے بچانے کے لیے پنڈت جواہر لعل نہرو نے کوآپریٹو موومنٹ کو کامیابی کا راستہ بتایا تھا۔ مٹھو چاچا نے پنڈت نہرو کی اس آئڈیالوجی کا بڑی چالاکی سے استعمال کیا اور اپنی سوچ کو حقیقت کا رنگ

دیا۔ مجھے یاد ہے کہ مٹھو چاچا غریبوں کی بھلائی کے کام کرنے کے لیے کتنے بے چین رہا کرتے تھے۔ کوآپریٹو کے میدان میں انھوں نے کہیں سے کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی، اس کے باوجود وہ اس کا گہرا علم رکھتے تھے۔ یہ واقعی میں ایک شاندار کارنامہ تھا۔ حالات چاہے جو بھی ہوں، انھوں نے اپنی زندگی میں ایمانداری اور لگن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔''

سنٹرل الیکٹری سٹی اتھارٹی کے سابق چیئرمین، جناب رامیشور ناتھ شریواستو کہتے ہیں کہ مرزا صاحب صلاحیت اور انسانی برتاؤ کو سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ بے معنی چیزوں میں وہ اپنا وقت کبھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ بقول آر این شریواستو، ''شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی اچھی طرح جانتا ہے کہ میچ جیتنے کے لیے اسے کس مہرے کو کہاں رکھنا ہے۔ بیگ صاحب بھی لوگوں کی صلاحیتوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ کس کام کو کرانے کے لیے کس سے ملنا ہے۔ وہ نیٹ ورک بنانے کے ماہر تھے اور اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ بہترین رشتے تبھی بنتے ہیں، جب کسی کو کھانے پر مدعو کیا جائے۔ اسی لیے، اُن کے پاس ملنے کے لیے جب بھی کوئی آتا، تو وہ اسے کھانا ضرور کھلاتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک مہمان نواز اور لوگوں کی تواضع کرنے والے شخص تھے۔ اسی دوستانہ فطرت کی وجہ سے انھیں لوگوں تک پہنچنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کوآپریٹو موومنٹ میں وہ بہت یقین رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کوآپریٹو موومنٹ ایک ایسی طاقتور تحریک ہے، جس سے پس ماندہ لوگوں کے زیادہ تر مسائل آسانی سے حل کیے جا سکتے ہیں اور انھیں سر اٹھا کے جینے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے باہر نکل کر ایسے لوگوں کی پہچان کی اور پھر انھیں ایک ساتھ جمع کیا، تاکہ انھیں فائدہ پہنچا سکیں۔''

جناب آر این شریواستو نے مزید بتایا کہ ''جامعہ کوآپریٹو بینک بنانے کے لیے چند لازمی شرائط کو پورا کرنا ضروری تھا، جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس کے لیے آپ کے پاس اتنے لوگ اور اتنا فنڈ ہونا چاہیے۔ یہ ایک مشکل کام تھا، لیکن مرزا صاحب نے پوری ہمت سے اس کام کو شروع کیا۔ انھوں نے ہر طرح کے لوگوں سے رابطہ کیا، چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے۔ انھوں نے سب کو اپنا مدعا سنایا اور ان کی طرف سے جو کچھ بھی ملا، شکریہ کے ساتھ انھوں نے اس کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ بات

کرتے وقت انھوں نے ان لوگوں کے سامنے کبھی یہ شرط نہیں رکھی کہ انھیں اتنا پیسہ دینا ہی دینا ہے۔ اُن کے لیے ہر مدد اہم تھی، چاہے وہ چھوٹی رہی ہو یا بڑی۔ نظریاتی طور پر انھوں نے پورے صبر وتحمل اور عزم وحوصلے کا اظہار کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ذاکر باغ جیسا مشکل کام مکمل ہو پایا، ورنہ اُس وقت کا بڑے سے بڑا آدمی ایسے پروجیکٹ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے قریبی دوست اور فطرتاً ایک بڑے شاعر، نظام الدین اعظمی نے اُن کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''مرزا صاحب ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کو دھوتے رہتے تھے، اور ایسا کرتے وقت لگتا تھا کہ وہ اپنا دل دھو رہے ہیں۔ جہاں تک بچوں پر شفقت ورحمت کی بات ہے، تو انھوں نے اپنے بچوں اور غیروں کے بچوں میں کوئی تفریق نہیں کی۔ بلکہ، انھوں نے اپنے بچوں کے مقابلے دوسروں کے بچوں کو زیادہ ترجیح دی۔ ان کے سامنے سب برابر تھے، سب عزت واحترام کے لائق تھے، چاہے وہ عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہا ہو یا پھر جھگیوں میں رہنے والا کوئی شخص ہو۔ ان کے اندر نفرت وعداوت، کینہ وکدورت یا پھر اس قسم کی کوئی بھی منفی چیز نہیں تھی، بلکہ وہ ان سب سے پاک تھے۔ وہ لوگوں کو خدا کی مخلوق سمجھ کر گلے لگانے میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے حتی المقدور لوگوں کی مدد کی، بعض دفعہ تو ان چیزوں سے بھی، جن کی خود انھیں سخت ضرورت تھی۔''

ابوسلیم، جنھیں پیار سے لوگ ''منا بھائی'' کہتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں، ''کمزور طبقوں کی مدد کرنے کے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے، مرزا فرید الحسن بیگ دہلی میں ایک معیاری اسکول قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی باریکیوں کو سمجھنے پر انھوں نے کافی وقت خرچ کیا، لیکن اس سے کنارہ کش ہو گئے، اس لیے کہ اس میں کافی پیسہ درکار تھا، جو کہ اُس وقت ان کے پاس نہیں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے غریبوں کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے مقصد سے ایک کوآپریٹو بینک کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ہولی فیملی اسپتال میں چیف فارماشسٹ (دواساز) بن گیا۔ مرزا صاحب نے مجھے بلایا اور کریئر سے متعلق میرے پلان کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ یا تو میں دوا بنانے والی فیکٹری کھول سکتا ہوں یا پھر کسی ایسی تنظیم کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں، جو میرے بہتر مستقبل کی ضامن ہو سکے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ وہ

میرے دوسرے متبادل پر مدد فراہم کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے، انھیں دنوں سعودی عرب سے ایک وفد آیا ہوا تھا، جسے فارماشسٹ کی تلاش تھی۔ مرزا صاحب نے آگے بڑھ کر اور اپنے تمام وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ میرا تقرر وہاں اسسٹنٹ فارماشسٹ کے طور پر ہو جائے۔ میں نے آٹھ سال ریاض میں گزارے، جہاں مجھے اچھی تنخواہ ملی اور میں ترقی کرتے ہوئے چیف فارماشسٹ کے عہدہ پر پہنچ گیا۔

''ایک بار میں اپنی سالی کی بیٹیوں کے مستقبل کو لے کر کافی فکرمند تھا۔ وہ پڑھنے میں بہت تیز تھیں، لیکن مالی پریشانیوں کے سبب اپنی تعلیم کو جاری نہیں رکھ پا رہی تھیں۔ میں نے انھیں دہلی بلایا اور اس مسئلہ پر مرزا صاحب سے بات کی۔ وہ ان لڑکیوں کو فوراً جسٹس ایس این کمار کے پاس لے گئے، جہاں جسٹس صاحب کی اہلیہ ارچنا کمار نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا داخلہ لیڈی اِروِن اسکول میں کرا دیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مرزا صاحب نے محترمہ ارچنا کمار کو رات کے کھانے پر بلایا اور تمام اخراجات خود برداشت کیے۔ میں نے پیسہ دینے کی پیشکش کی، لیکن انھوں نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ میری نظر میں، مرزا صاحب انسانیت کے لیے خدا کی نعمت تھے، جنھوں نے ضرورت مندوں کی زندگی بھر بے لوث خدمت کی۔ میں ان کے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے ان کا احسان مانتا ہوں۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے پوتوں میں سے ایک، مرزا ثاقب بیگ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''دادا کو جن دنوں علاج کے لیے چین لے جایا جا رہا تھا، انھوں نے مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ جس طرح چین، امریکہ، برطانیہ اور یوروپ کے دیگر ممالک میں علاج و معالجہ کے نہایت اعلیٰ اور معیاری اسپتال ہیں، ویسے ہی اسپتال ہندوستان میں بھی ہونے چاہئیں۔ ایک سچے وطن پرست کے طور پر، وہ اپنے ملک میں بھی سماج کے غریب اور کمزور طبقوں کے لیے بہترین طبی خدمات مہیا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔

''اگر کوئی آدمی ان کے سامنے کوئی غلط لفظ یا ناشائستہ زبان استعمال کرتا، تو ناراضگی کے طور پر ان کے منھ سے نکلتا 'دھت تیری کی'۔ وہ اُس آدمی کو یہ کہہ کر پھٹکار بھی لگاتے کہ 'تم جامعہ کا نام خراب

کر رہے ہوں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ کسی کے منھ سے اس کے خلاف ایک بھی لفظ سننا یا اس ادارہ کی توہین کرنا برداشت نہیں کرتے تھے۔

''جہاں تک اللہ سے لگاؤ کا تعلق ہے، تو میں نے انھیں پوری طرح خدا کا فرماں بردار پایا۔ نماز کے وقت، میں نے تیمّم کرنے میں ان کی مدد کی۔ بیماری کی حالت میں بھی انھوں نے کبھی نماز نہیں چھوڑی۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے پوتوں میں سے ایک، مرزا راحیل بیگ کہتے ہیں، ''مرزا فرید الحسن بیگ میرے دادا تھے اور میرے ایک شاندار رہنما (گائڈ) بھی۔ میرے بچپن سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک، مرزا صاحب میرے لیے فکرمند رہے۔ اُس وقت چونکہ کساد بازاری کا دور تھا، اس لیے ایم سی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے کوئی نوکری نہیں مل پا رہی تھی۔ دادا نے مجھے حوصلہ دیا اور میری بے روزگاری کا حل نکالنے کے لیے کافی محنت کی۔ انھوں نے این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ سے بات کی اور تب جا کر ان کی سفارش پر مجھے نوکری ملی۔

''ان کی بہت ساری حصولیابیاں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی ان کے ذاتی مفاد سے تعلق نہیں رکھتی۔ انھوں نے جو کچھ سوچا اور کیا، وہ پوری طرح بے غرضانہ تھا اور صرف سماج کے غریب طبقوں کو خوشحال بنانے کے لیے تھا۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اللہ نے ان پر خاص کرم فرمایا تھا، جس کی وجہ سے ہی وہ اتنے بڑے بڑے کام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اللہ میں ان کا یقین اتنا پختہ تھا کہ انھوں نے جو بھی کام شروع کیا، اسے مکمل کر کے ہی دَم لیا۔

''اعظم گڑھ کے لوگوں کے لیے میرے دادا ایک مسیحا کی طرح تھے، جنھوں نے ان کے مسائل کو حل کرنے میں اپنی پوری قوت لگا دی۔ وہ جب بھی ان کے پاس آتے، وہ انھیں اپنے گھر میں ٹھہراتے، جب تک ان کا قیام رہتا، تب تک ان کی بہترین مہمان نوازی اور دیکھ بھال کرتے اور وہاں سے جانے کے لیے کبھی نہیں کہتے۔ یہ ان کا بڑپن ہی تھا کہ بہت زیادہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے چہرے پر کسی قسم کی شکن لائے بغیر لوگوں کی خدمت کرتے۔ میں ان کی شخصیت سے کافی متاثر ہوں۔ ان کے کاموں پر مجھے فخر ہے اور ان کی محبت و شفقت کا احسان مند ہوں۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے نواسہ، فرحان علوی کہتے ہیں، ''مرزا فرید الحسن بیگ میرے نانا تھے، جنھوں نے ایک کامیاب زندگی بسر کرنے میں میری کافی ہمت افزائی کی۔ ان کی دردمندی اور معتدل مزاجی سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور اپنی زندگی کو صحیح سمت عطا کی۔ آج میں جو کچھ ہوں، انھیں کی وجہ سے ہوں۔ میرے اوپر ان کا بہت احسان ہے۔''

مرزا منصور بیگ کے مطابق، مرزا فرید الحسن بیگ نے خدمت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ وہ آگے کہتے ہیں، ''لوگ یہ سوچ کر غریبوں سے ملنے سے کتراتے ہیں کہ وہ ان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ لیکن، مرزا صاحب کا معاملہ بالکل الگ تھا۔ کسی پریشان حال کی مدد کرنے سے ان کے چہرے پر چمک آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ، وہ اپنے ہوم ٹاؤن کے لوگوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ چونکہ میں ہر تیسرے مہینے اعظم گڑھ جاتا ہوں، اس لیے مرزا صاحب وہاں کے حالات کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیشہ مجھ پر انحصار کیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ بیمار پڑ گئے، جس کی وجہ سے انھیں اسپتال میں بھرتی کرایا گیا۔ اُس نازک حالت میں بھی وہ شبلی انٹر کالج میں ہونے والے انتخابات کے نتائج کو جاننے کے لیے بیتاب تھے اور انھوں نے مجھ سے معلومات حاصل کرنی چاہی۔ نتیجہ آنے میں دیر ہوئی اور اس کا اعلان دیر رات میں ہوا۔ میں نے رات میں ان کو اطلاع نہیں دی، یہ سوچ کر کہ ان کی نیند میں خلل پڑے گا۔ لیکن، اگلے دن صبح سویرے ہی ان کا فون آ گیا۔ انھوں نے مجھے ڈانٹ لگائی کہ میں نے رات میں ہی ان کو اس خبر سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ وہ نتیجہ جاننے کے لیے اتنے بے چین تھے کہ رات بھر سو نہیں پائے۔ یہ تھا اعظم گڑھ کے تئیں ان کا لگاؤ اور پیار۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے بھتیجا ڈاکٹر عاطف بیگ کہتے ہیں، ''مرزا صاحب ہم سبھی کے لیے ایک بڑے راہبر تھے، جنھوں نے 'انسانیت کی خدمت' کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ انھوں نے ہمیں رشتوں کی اہمیت بتائی اور یہ سکھایا کہ بیکار چیزوں پر ہم اپنا وقت برباد نہ کریں۔ انھوں نے کبھی بھی کسی کام کے بارے میں یہ نہیں سوچا کہ یہ بڑا ہے یا چھوٹا۔ انھوں نے ہمیں دوسرے انسانوں کے ساتھ عاجزی وانکساری اور گرم جوشی کا رویہ اپنانے کی تلقین کی۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کی بھتیجی، نشاط آرا خورشید علی اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں،

''مجھے ایک واقعہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں تیسری کلاس میں پڑھتی تھی۔ اس وقت میں نے مرزا فریدالحسن بیگ کو ایک خط لکھا، جس میں میں نے اپنی تعلیم کے بارے میں ان کو بتایا۔ ان کے ہمدرد دل نے جوش مارا اور چند دنوں کے اندر ہی انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے بہت سی دلچسپ کتابیں بھجوا دیں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی، میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ میں ان کا شکریہ ادا کر پاؤں۔ بعد کے دنوں میں وہ میرے رابطہ میں رہے اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ وہ میرے بچوں سے بھی بہت پیار کرتے تھے اور انھیں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ انھوں نے میری فیملی کے تئیں جس پیار و محبت کا اظہار کیا، اس کے لیے میں ان کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔''

مرزا فریدالحسن بیگ کے قریب ساتھی، ڈاکٹر شکیل احمد بتاتے ہیں، ''مرزا صاحب کے جانے سے ایک بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ وہ جب ہمارے ساتھ تھے، تو میں اپنے تمام مسائل و تفکرات کو ان کے ساتھ شیئر کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا، اور وہ بغیر کوئی دیر کیے میری مدد کے لیے فوراً تیار ہو جایا کرتے۔ ان کی شخصیت اور مشفقانہ برتاؤ ایسا راحت بھرا ماحول تیار کر دیتا کہ ہم اپنا دل ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتے تھے۔ انھوں نے ایک اچھی نوکری کے لیے مجھے خلیجی ممالک بھیجنے میں بڑا رول ادا کیا، جس سے مجھے کافی مدد ملی۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے فیملی ممبران کی بہت اچھی ٹیم چھوڑی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سبھی 'دوسروں کی مدد کرنے' کے ان کے ورثہ کو آگے بڑھائیں گے۔ میں اللہ سے ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔''

سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید کے مطابق، مرزا فریدالحسن بیگ اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں منعقدہ مرزا صاحب کی تعزیتی میٹنگ میں سلمان خورشید نے کہا تھا کہ ''میں جب بھی علی گڑھ تحریک کی ایک مثال تلاش کرتا ہوں، تو میری نظر مرزا صاحب پر جا کر ٹھہرتی ہے، جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ مختلف لوگوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لا کر جمع کرنے کا کام کیا۔ انھوں نے ہمیں عملی طور پر یہ سکھایا کہ کیسے کوئی ادارہ قائم کیا جاتا ہے اور پھر اسے کامیابی کے ساتھ کیسے چلایا جاتا ہے۔ وہ مجھ سے اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے کہ کیسے اپنی قوم میں صحیح بیداری پیدا کی جائے، بہتر مستقبل کے لیے نوجوانوں کو کیسے تعلیم یافتہ اور بااختیار بنایا جائے۔''

سلمان خورشید نے مزید کہا کہ ''میرے نانا ڈاکٹر ذاکر حسین کی برسی پر مجھ سے سب سے پہلے ملنے والے شخص مرزا صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ یہی نہیں، وہ امام صاحب کے ملنے سے پہلے ہی میرے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان کو ہمارا صحیح خراجِ عقیدت یہی ہوگا کہ ہم اُن کے ذریعہ قائم کردہ اداروں کو اگلی منزل تک پہنچا دیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ جنت میں ان کے درجات بلند کرے۔ لیکن، جیسا کہ ان کی عادت تھی، جنت میں بھی وہ یہی کہیں گے، ''چلو، یہاں بھی کچھ نیا کرتے ہیں۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ پروفیسر اختر الواسع مرزا صاحب سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں، ''اگر مجھے صحیح صحیح یاد ہے، تو مرزا فرید الحسن بیگ صاحب سے میری پہلی ملاقات 1980 میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کو ہمیشہ سماج کے پس ماندہ، مظلوم اور غریب طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے فکرمند پایا۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کا بے انتہا پیار و محبت ملا۔ وہ اسلام کی اس تعلیم کا جیتا جاگتا ثبوت تھے کہ جب کسی کو ایک ہاتھ سے کچھ دو، تو دوسرے ہاتھ کو اس کا پتہ نہ چلے۔''

ہندوستانی کمیشن برائے لسانیاتی اقلیتیں کے قومی کمشنر اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سابق ڈائرکٹر، پروفیسر اختر الواسع مزید کہتے ہیں، ''وہ ایک مذہبی آدمی تھے، لیکن اس کے باوجود کوئی ان کے سیکولر کردار پر سوالیہ نشان نہیں لگا سکتا۔ وہ ہمیشہ سب کو ملا کر چلنے میں یقین رکھتے تھے۔ مہمان نوازی میں ان کی فیملی کا جواب نہیں۔ ان کی اہلیہ ان کے تمام کاموں میں برابر کی شریک تھیں۔ ایک عورت اپنے شوہر کی شخصیت میں کس طرح چار چاند لگا سکتی ہے، کسی کو اگر یہ دیکھنا ہو، تو وہ مرزا صاحب کی فیملی کو دیکھ سکتا ہے۔''

اصل معنوں میں مرزا صاحب کون تھے، اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع کہتے ہیں کہ ''میں نے ماہر تعلیم، مرحوم سید حامد صاحب کے ساتھ ایک بار انجان شہید کا دورہ کیا۔ میں مرزا صاحب کی مخصوص خوبیوں اور انسانوں کی بے لوث خدمت کی وجہ سے ان کا بڑا مداح رہا ہوں۔ مرزا صاحب کو جاننے کے لیے ہمیں ان کی زندگی میں 1971 کے بعد پیش آنے والے حالات کو دیکھنا چاہیے۔ ملک کی آزادی کے وقت جو لوگ پیدا ہوئے، 1971 میں ان کی عمر 35 سال

کی ہو چکی تھی۔ مرزا صاحب ایسے وقت منظر عام پر آئے، جب لوگ جانبداری، فرقہ وارانہ تعصب اور عدم تحفظ کے احساس سے جوجھ رہے تھے۔ ایسے میں انھوں نے لوگوں کے اندر یہ اعتماد جگایا کہ اگر آپ کے اندر ہمت، لگن اور دوراندیشی ہے، تو آپ اسی شہر میں ذاکر باغ بھی بنا سکتے ہیں، جس شہر میں 48-1947 کے دوران مسلم بستیوں کو اجاڑ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی آپ اپنی برادری کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

''اور وہ یہیں پر نہیں رکے۔ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے انھوں نے جامعہ کوآپریٹو بینک کے ذریعہ لوگوں کی، ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں بھی مدد کرنی شروع کر دی۔ انھوں نے لوگوں کو اپنا گھر خریدنے اور مالی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کی اور ساتھ ہی ایک ایسے علاقے میں اپنا کاروبار شروع کرنے کے لائق بنا دیا، جس علاقہ کو مالیاتی اداروں اور بینکنگ سیکٹر نے بلیک لسٹ کر دیا تھا۔ انھوں نے لوگوں کو ان کی پریشانیوں سے باہر نکالا۔ یہ لوگ آج خوشحال ہیں اور عزت و وقار کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

جامعہ کوآپریٹو بینک کی اہل کار ثمرین فاطمہ، جنہیں مرزا صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، بتاتی ہیں کہ مرزا فرید الحسن بیگ کا زور اس بات پر تھا کہ لڑکیوں کو کیسے مضبوط، تعلیم یافتہ اور بااختیار بنایا جائے، اور اس کے لیے جہاں کہیں بھی موقع ملا، انھوں نے اس کا بھرپور استعمال کیا۔

بقول ثمرین فاطمہ، ''ہمارا بینک صرف غریب طبقہ کے لیے ہے۔ اگر کوئی ایسا آدمی یہاں قرض (لون) لینے کے لیے آتا، جس کے پاس ممبر شپ فارم خریدنے کے بھی پیسے نہیں ہوتے، تو مرزا صاحب خود اپنی جیب سے اسے پیسے دے دیا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے مرزا صاحب، ڈاکٹر شبستاں غفار، جسٹس ایم ایس اے صدیقی وغیرہ کے ساتھ اعظم گڑھ جانے کا موقع ملا، جہاں ہمیں فرینڈ شپ ڈے کی ایک ایوارڈ تقریب میں شرکت کرنی تھی۔ اس سفر کے دوران مجھے پتہ چلا کہ مرزا صاحب علم و دانش کے کتنے بڑے گہوارہ تھے۔ وہ وقت تو چلا گیا۔ لیکن، انھوں نے مجھے یہ ضرور سکھا دیا کہ اگر ہمیں کوئی کام کل کرنا ہے، تو ہمیں اسے ابھی کر لینا چاہیے، کیوں کہ ہوسکتا ہے ہمیں کل کو دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ اور اگر ہم اس کام کو ابھی کر لیتے ہیں، تو وہ کام پورا بھی ہو جائے گا اور ہمیں اس کے لیے اگلے

دن تک پریشان بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ 'حرکت میں برکت' ہے۔''

مرزا صاحب کی شخصیت کے ایک اور گوشہ کو اجاگر کرتے ہوئے کہ اصل مرزا فرید الحسن بیگ کون تھے، نئی دنیا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی بتاتے ہیں کہ ''وہ مجھے اور میرے اخبار، دونوں سے محبت کرتے تھے۔ ہمارے درمیان نہایت دوستانہ اور روحانی رشتہ تھا۔ میری اور بیگ صاحب کی آئڈیالوجی ایک ہی تھی۔ چونکہ میرا بھی یہی ماننا ہے کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے طور پر نہیں، بلکہ ہندوستانیوں کے طور پر، زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے اندر مقابلہ آرائی اور مہارت پیدا کرنی چاہیے اور اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے حقوق حاصل کرنے چاہئیں۔ اگر آپ مقابلہ آرائی کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہیں، تو اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ اپنے حقوق پانے کے لیے آپ کو دوسروں پر سبقت حاصل کرنی پڑے گی۔''

شاہد صدیقی نے مزید بتایا کہ ''رکن پارلیمنٹ کے طور پر، میں نے بہت سے اسکولوں کو فنڈ دیے۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ پیسے لینے کے بعد زیادہ تر لوگ بے پرواہو گئے۔ ان میں سے کسی کے پاس نہ تو اس چیز کا کوئی حساب کتاب تھا اور نہ ہی منصوبہ کہ ان فنڈس کا استعمال کیسے کیا جائے، لیکن مرزا صاحب نے ہمیشہ سنجیدگی دکھائی اور لگاتار میرے رابطہ میں رہے۔ جب کبھی ضرورت ہوئی، وہ مجھے کام کی پیش رفت اور رفتار کے بارے میں بتاتے رہے۔ میرے ذریعہ فراہم کردہ زیادہ تر رقم، بغیر کسی غلطی کے، تعلیم پر خرچ کی گئی۔''

رامیشور ناتھ شریواستو کے مطابق، کوآپریٹو موومنٹ میں مرزا صاحب کا عقیدہ، ان کی سنجیدگی، لگن اور پختہ عزم ان کی کامیابی کے اہم راز تھے۔ آر این شریواستو مزید بتاتے ہیں، ''مجھے یاد ہے، ایک دن کسی نے مجھے بتایا تھا کہ مدن موہن مالویہ کے ذہن میں جب بنارس ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال آیا، تو انہوں نے جی ڈی برلا سے کچھ مدد حاصل کرنی چاہی۔ اس کے لیے وہ ان کے گھر ملنے کے لیے گئے۔ مسٹر برلا سے ملاقات کے لیے وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ تبھی انھوں نے دیکھا کہ مسٹر برلا اپنے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ سے بحث کر رہے ہیں کہ کیوں ایک چھوٹی سی رقم کا حساب میل نہیں کھا رہا ہے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ اس رقم کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا، جب کہ مسٹر برلا لگاتار اس سے

بحث کرتے رہے اور اپنے اکاؤنٹینٹ کو انھوں نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اتنی چھوٹی سی رقم کو بھی نظر انداز کر دے۔

''یہ دیکھ کر مالویہ جی نے ان سے معذرت طلب کی اور وہاں سے اٹھ کر واپس چل پڑے۔ اُن کو وہاں سے جاتا ہوا دیکھ، مسٹر برلا نے آواز لگائی اور واپس آنے کے لیے کہا۔ انھوں نے مالویہ جی سے واپس جانے کی وجہ پوچھی، تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ اُن سے ایک بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے تھے، لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ اتنی چھوٹی سی رقم کے لیے بحث کر رہے ہیں، تو سوچا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، جہاں سے ان کی امید پوری نہیں ہو سکتی۔

''مسٹر برلا مالویہ جی کی اس صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے ایک خالی چیک ان کو تھما دیا کہ وہ جتنی رقم چاہیں، اس پر لکھ لیں۔ میرے خیال سے، مرزا صاحب بھی اسی مزاج کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور اسی لیے مرزا صاحب کو ذاکر باغ کے اپنے پہلے پروجیکٹ میں ہی لوگوں کا خاصا اعتماد حاصل ہو گیا۔ اسی اعتماد کی وجہ سے، جب انھوں نے جامعہ کوآپریٹو بینک کی بنیاد ڈالی، تو لوگوں کا ایک بڑا گروہ ان کا ساتھ دینے کے لیے آسانی سے تیار ہو گیا، ورنہ اتنے بڑے کام کو انجام دے پانا ممکن نہیں تھا۔''

مرزا صاحب کے قریبی دوست رہ چکے چودھری رگھوناتھ سنگھ، ان کے بارے میں مزید بتاتے ہیں کہ ''ڈاکٹر ذاکر حسین کے بعد، پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ معیاری تعلیم فراہم کرنے کے تئیں یہ بھی اتنے ہی سنجیدہ تھے، جتنے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ان کے وائس چانسلر بننے کے بعد مرزا صاحب نے راحت کی سانس لی کہ جامعہ ایک بار پھر محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ مرزا صاحب جامعہ سے جذباتی طور پر اتنے جڑے ہوئے تھے کہ وہ وہاں پر ایک معمولی سی غلطی بھی سرزد ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جامعہ میں تعلیم کا سلسلہ کبھی رکے، ورنہ نوجوان نسل کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے ایک ملازم کے طور پر دہلی ایڈمنسٹریشن میں شمولیت اختیار کی، تو وہ بھی میرے ساتھ اس میں شامل ہو گئے۔ وہ فرطِ محبت سے کہا کرتے تھے کہ 'تم جہاں بھی جاؤ گے، میں تمہارا پیچھا کرتا رہوں گا میرے دوست۔

''جب صاحب سنگھ ورما دہلی کے وزیر اعلیٰ بنے، تو میں نے اپنے گھر پر ایک پروگرام رکھا۔ مرزا صاحب بھی تشریف لائے اور وہاں پر بھی ان کو یہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ کیسے پس ماندہ لوگوں کی حالت زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ ایک بار جب ڈی ڈی اے کے لوگ بٹلہ ہاؤس میں مکانوں کو گرانے کے لیے آئے، تو مرزا صاحب ایک لمحہ کے لیے بھی وہاں سے نہیں ہٹے۔ انھوں نے اپنے تمام جاننے والوں کو فون کیا، آخر کار مکان گرانے والی ٹیم کو وہاں سے واپس جانا پڑا۔

''ایک دوسرے موقع پر، جب ڈاکٹر ذاکر صاحب کا انتقال ہوا، اُس وقت خورشید عالم خان ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدہ پر فائز تھے۔ ہم ان کے پاس گئے اور کہا کہ ذاکر صاحب کی بیگم ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انھیں اندرا گاندھی سے مل کر خورشید عالم خان کو راجیہ سبھا کا رکن بنانے کی درخواست کرنی چاہیے۔ اس آئڈیا نے کام کیا اور اس طرح محترمہ گاندھی خورشید عالم خان کو پہلے راجیہ سبھا کا رکن اور پھر وزیر خارجہ بنانے کے لیے راضی ہو گئیں۔''

چودھری رگھوناتھ سنگھ مزید بتاتے ہیں، ''مرزا فرید الحسن بیگ اور مجھ میں کافی بنتی تھی۔ ہم دونوں کی سوچ ایک جیسی تھی، جس کی وجہ سے ہمارا رشتہ کافی مضبوط تھا۔ وہ اکثر مجھے دعوت دیا کرتے اور کہتے کہ ''اللہ دیوے اور بندہ کھاوے۔''

یونائٹیڈ پریشر کوکر گروپ کے مینجنگ ڈائرکٹر، رحمٰن الٰہی کے مطابق، دوسروں کی مدد کے لیے مرزا فرید الحسن بیگ کی ڈکشنری میں 'کل' لفظ تھا ہی نہیں۔ ''مرزا فرید الحسن بیگ دوسروں کی مدد کے لیے چوبیسوں گھنٹے تیار رہتے۔ ایک بار اپنے بچے کے داخلہ کے لیے میں نے ان سے مدد چاہی۔ ابھی میں اپنا جملہ پورا بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ کھڑے ہو گئے اور بولے، چلئے ابھی چل کر متعلقہ شخص سے ملاقات کرتے ہیں۔ انھوں نے اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لیا، گویا یہ ان کا ہی کام ہو اور جب تک کام پورا نہیں ہو گیا، وہ وہاں سے نہیں ہٹے۔'' رحمٰن الٰہی مرزا صاحب کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ وہ مرزا صاحب کے ساتھ مسلمانوں کو درپیش مسائل پر بات کرتے ہوئے وقت گزارتے اور اس بات پر غور و فکر کیا کرتے کہ نوجوانوں کو بہتر مستقبل کے لیے تیار کرنے میں ان کے اندر بیداری کیسے لائی جائے۔''

رحمٰن الٰہی، جو کہ سرووتم انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے چیئرمین اور سرووتم انٹرنیشنل اسکول اور میوراسکول، نوئیڈا کے مینجمنٹی بھی ہیں، نے مزید بتایا کہ ''مرزا صاحب جب ذاکر باغ بنا رہے تھے، تب ان کے مخالفین نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ تعمیراتی کام میں ہلکے میٹریل استعمال کیے جائیں، لیکن مرزا صاحب نے کوالٹی سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور خوبصورت، آرامدہ اور بہترین ٹکنالوجی پر مبنی عمارت کا نمونہ پیش کیا۔ یہ واقعہ ان کی ایمانداری، سنجیدگی اور لگن کی پوری کہانی بیان کرتا ہے۔''

مرزا صاحب کے بچپن کے دوست، فرقان ہاشمی کچھ یادوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''دنیا کا سب سے بڑا کام کسی کی سوچ کو بدلنا ہے۔ میں مرزا صاحب کو پورا کریڈٹ دیتا ہوں کہ انھوں نے میری سوچ کو نئی شکل عطا کی، جس نے میری پوری شخصیت ہی بدل کر رکھ دی۔ دراصل، انھوں نے مجھے زندگی جینے کا اصلی ہنر سکھایا، جس نے مجھے فخر کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں مدد کی۔''

مرزا صاحب کا احسان مانتے ہوئے، فرقان ہاشمی ان کے بارے میں اپنے احساسات و تجربات کا ذکر کرتے ہوئے آگے بتاتے ہیں کہ ''بچپن میں اپنا وقت میں نے ان کے پڑوس میں گزارا، جہاں میں یہ دیکھتا تھا کہ مرزا صاحب اکثر سوشل ورک کے مختلف کاموں میں مصروف رہتے۔ وہ یا تو نالیوں کو صاف کرر ہے ہوتے، لوگوں کو ان کا راشن کارڈ بنوانے میں مدد کرر ہے ہوتے، ان کے بجلی بل، ٹیلی فون بل کو ٹھیک کرا رہے ہوتے، کسی کا داخلہ اسکول میں کرا رہے ہوتے، یا پھر بزرگوں اور بے سہارا لوگوں کو اسپتال پہنچا رہے ہوتے تھے۔ سوشل ورک کے ان کاموں نے میرے معصوم ذہن پر یہ اثر ڈالا کہ زندگی صرف اپنی پسند کا کھانا کھانے، اچھا گھر بنانے، منافع بخش تجارت کرنے یا پھر صرف اس طرح زندگی گزارنے کا نام نہیں ہے کہ آئندہ کل نہیں آئے گا۔ بلکہ دوسروں کی دیکھ بھال کرنے اور ضروریات کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرنے کا نام زندگی ہے۔ میں سوشل ورک کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ مرزا صاحب نے اس وقت میرے ذہن میں 'انسانیت کی خدمت کرنے' کے بیج بو دیے ہیں۔''

مرزا صاحب کے بھتیجے اور کناڈا کے سابق ٹریڈ کمشنر، مرزا فیصل بیگ نے مرزا فرید الحسن بیگ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ان الفاظ میں کیا، ''جب میرے بیٹے نے میتھ میں سو فیصد نمبرات

حاصل کر کے بورڈ کے امتحان میں اسپیشل پوزیشن حاصل کی، تو مرزا صاحب کافی خوش ہوئے۔ وہ مٹھائی لے کر آئے اور سب کو اس خوشی میں شامل کیا۔ بچوں کے لیے ان کے دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ وہ سب کو اپنی فیملی کا ہی حصہ مانتے تھے۔ علاج کی غرض سے، تعلیم کے لیے یا پھر نوکری کی تلاش میں جب بھی کوئی شخص ان کے پاس آتا، وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتے۔ ہولی فیملی اسپتال میں جب میں اُن سے ملا، تو وہ مجھ سے اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں بات کرنے لگے۔ میں نے ان کے ساتھ 3-2 گھنٹے گزارے۔ وہ نتائج کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ نتائج کا اعلان جیسے ہی ہوگا، میں ان تک اطلاع پہنچا دوں گا۔ انھیں اپنی بیماری کی پروا نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے وطن کے لیے زیادہ فکرمند تھے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا محفوظ بیگ نے بتایا کہ ''ان کے دماغ میں بس یہی دھن سوار تھی کہ جامعہ کو آپریٹو بینک کا مستقبل کیا ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بینک کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہونا چاہیے، جسے یقینی بنانے کے لیے ہر چیز کا انتظام بہترین طریقے سے کیا جانا چاہیے، کیوں کہ اگر جامعہ بینک نہیں ہوگا، تو لاکھوں غریب اور بے سہارا لوگوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔''

مرزا صاحب چنوتیوں سے پیچھے کبھی نہیں ہٹے۔ تو کیا، ابھرتا ہوا سماجی تناؤ اور بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی نے ان کے ذہن پر کوئی منفی اثر ڈالا تھا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مرزا فیصل بیگ بتاتے ہیں کہ ''سماجی ہم آہنگی کو برباد کرنے والے بعض واقعات سے وہ کافی پریشان ہو گئے تھے۔ انھوں نے تیزی سے پھیلتی ہوئی فرقہ وارانہ نفرت کو محسوس کر لیا تھا اور کہا تھا کہ ہم سبھی کافی مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ وہ اس کے لیے کافی فکرمند تھے، اسی لیے انھوں نے سماج میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بحال کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کے ایک بڑے پیروکار تھے۔ اسی گنگا جمنی تہذیب نے ہندوستان کو ایک قوم کے طور پر ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھنے کا موقع فراہم کیا اور اس ملک کی عظیم شخصیات نے اس پر ہمیشہ فخر محسوس کیا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کو سمجھنے کی کوششوں کو جاری رکھتے ہوئے، ہم نے ان کے سلسلہ نسب کو بھی

تلاش کرنے کی کوشش کی، جو مغلوں سے جا کر ملتا ہے۔ یہ خاندانی سلسلہ جنوب مشرقی ایشیا، خاص کر افغانستان، ازبیکستان، ایران اور منگولیا تک پھیلا ہوا ہے۔ اُن کا تعلق اس عظیم مغلیہ خاندان سے تھا، جس نے اکبر اور بابر جیسے طاقتور حکمراں دیے، جنھوں نے اپنی سخاوت، انصاف اور سماجی ہم آہنگی کی بدولت لوگوں کے دلوں پر راج کیا۔ مرزا فرید الحسن بیگ کے تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے بھائی کا نام مرزا احسان اللہ بیگ تھا، جو ایک ماہر تعلیم تھے اور جنھوں نے تعلیم کے ذریعہ 'انسانیت کی خدمت' کا اصول اپنایا۔ انھوں نے لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے اور حتی المقدور ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ ان کے بچوں کے نام یوں ہیں: مرزا آصف بیگ، مرزا عارف بیگ، مرزا انور بیگ، راحت بیگ، تسنیم بیگ اور زرینہ بیگ۔ مرزا احسن اللہ بیگ کے بعد دوسرے بھائی تھے مرزا صدر الدین بیگ، جنھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے اسلامی تعلیم حاصل کی اور مولانا آزاد انٹر کالج میں اعزازی ٹیچر کی خدمات انجام دینے کے بعد زاہدانہ زندگی بسر کی۔ ان کے وارثین میں چار بیٹے – مرزا مبین بیگ، مرزا جمال بیگ، مرزا ارشاد بیگ، مرزا نوشاد بیگ اور ایک بیٹی، شاہین بیگ شامل ہیں۔ تیسرے بھائی مرزا بدر الدین بیگ تھے، جن کا جواں عمری میں ہی انتقال ہو گیا۔ وہ رشتوں کا احترام کرنے اور انھیں مضبوط بنانے پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے اتنی الفت و محبت رکھتے تھے کہ ان کے پاس اناج یا اس قسم کی جتنی بھی غذائی اشیاء ہوتیں، وہ انھیں اپنے رشتہ داروں کو دینے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے بچوں کے نام ہیں: مرزا ضیاء الدین بیگ، فرحت بیگ، شفقت بیگ، عفت بیگ اور طلعت بیگ۔

مرزا فرید الحسن بیگ

بچپن

بچپن میں مٹھو سنجیدہ، رحم دل، مددگار، میل ملاپ اور غور وفکر کرنے والے انسان تھے۔ زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی انھوں نے اپنے رابطے میں آنے والے ایسے کسی بھی انسان سے منھ نہیں موڑا، جو پریشان حال اور ستم زدہ ہو۔ درد میں ڈوبے ہوئے اُس انسان کے چہرے پر جب تک وہ مسکان نہیں بکھیر دیتے، تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

پرائمری اسکول کی پڑھائی کے دوران، ایک دن میں جب تک وہ 10 لوگوں کی مدد نہیں کر دیتے، تب تک پریشان رہتے تھے۔ لوگوں کی مدد کرنے سے انھیں ذہنی سکون ملتا تھا۔ وہ فرقہ وارانہ لڑائی کے خلاف تھے۔ موہن داس کرم چند گاندھی کی طرح انھوں نے بھی درج فہرست ذات (شیڈول کاسٹ) سے وابستہ لوگوں کو اوپر اٹھانے کی جی توڑ کوشش کی۔ وہ چھوا چھوت اور ذات پات کی بنیاد پر بھید بھاؤ کے پوری طرح خلاف تھے۔

اعظم گڑھ کے رسول پور گاؤں کے حاجی محمد امین بتاتے ہیں کہ فرید الحسن بیگ سماجی خدمت

سے متعلق اپنی پیاس کو بجھانے کے لیے اکثر ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کے ماموں حاجی محمد امین، جو اَب 100 سال سے بھی زیادہ عمر کے ہو چکے ہیں، نے مزید بتایا کہ ''ان کی نظر میں انسانی رشتوں کی سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ وہ بزرگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ میری ان سے وہ ملاقات اچھی طرح یاد ہے، جب مرزا صاحب اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ میں ایک دفعہ بیمار پڑا۔ ان کے پاس یہ خبر دیر رات میں پہنچی۔ انھوں نے مثالی ہمت کا مظاہرہ کیا اور تمام تر دقتوں کے باوجود وہ اسی رات میرے پاس پہنچ گئے۔ جب انھوں نے میری صحت کے بارے میں ساری جانکاری لے لی اور انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، تب جا کر انھیں اطمینان ہوا۔ اس کے علاوہ، انھیں جب کبھی بھی موقع ملتا، وہ خود ملنے کے لیے میرے پاس پہنچ جاتے۔ لوگوں سے گرم جوشی سے ملنا ان کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔''

محمد آباد، مئو کے شیخ صلو پانڈے مرزا صاحب کے بھانجے ہیں۔ اپنے ماموں کے ساتھ ان کی بہت بنتی تھی۔ ماموں - بھانجہ کا یہ رشتہ کافی مزیدار تھا۔ انھوں نے اپنی ایک شرارت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''ایک بار مٹھو ماموں میرے گھر آئے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اسی دن میرے پھوپھا، جو کہ خدائی طاقتوں میں یقین نہیں رکھتے تھے، وہ بھی میرے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ پورے زعم میں کہا کرتے تھے کہ وہ کسی بھی چیز سے نہیں ڈرتے اور غیبی طاقتوں پر یقین رکھنے والے ہم جیسے لوگوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

''حسن اتفاق سے، شام کے وقت پھوپھا جی کا پیٹ خراب ہو گیا اور انھوں نے کھلے میدان میں بیت الخلاء جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اندھیرے میں باہر نہ جائیں، لیکن انھوں نے ہمیں ڈانٹ دیا۔ انھوں نے پانی سے بھرا ہوا ایک لوٹا لیا اور بیت الخلاء کے لیے دور کھیتوں کی طرف نکل گئے، جہاں ایک بہت پرانا مہوا کا درخت ہوا کرتا تھا، جس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ اس درخت پر بھوت رہتے ہیں۔

''بھوت والے درختوں سے متعلق عجیب وغریب واقعات کے بارے میں انھوں نے سن رکھا تھا، لیکن اس کے باوجود ہم لوگوں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے وہ اُس طرف نکل پڑے۔ یہ دیکھ کر مٹھو

ماموں کو شرارت سوجھی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کہیں سے بڑے سائز کے دو سفید چادروں کا انتظام کروں، ساتھ ہی انھوں نے سوئی اور دھاگے لانے کے لیے بھی کہا۔ میں نے ان چیزوں کا انتظام فوراً کر دیا۔ انھوں نے چادروں کو سل کر ایک سفید ایپرن بنا دیا۔ ہمارے پاس تین جرمن شیفرڈ کتے تھے۔ ہم نے انھیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

''ماموں نے مجھے اپنے کندھوں پر کھڑا کر کے وہ ایپرن پہن لیا، یعنی اب ہم دونوں ہی اُس ایپرن کے اندر تھے۔ اب ہم دونوں نے آگے کی طرف چلنا شروع کیا، جس سے ایسا لگنے لگا کہ واقعی میں کوئی بہت بڑی چیز عجیب وغریب انداز سے چل رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ہیبت ناک آوازیں بھی نکالنی شروع کر دیں۔

''ہم جیسے ہی پھوپھا جی کی طرف بڑھے، کتوں نے بھی بھونکنا شروع کر دیا۔ یہ منظر اتنا خوفناک بن گیا کہ پھوپھا جی ڈر کے مارے بیت الخلاء کے دوران بیچ میں ہی اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ڈر اور خوف کی وجہ سے ان کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، پورا بدن کانپ رہا تھا، سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ گھر واپس بھاگتے ہوئے وہ بیچ میں کئی بار گرے بھی۔ خوف کا عالم یہ تھا کہ وہ اگلے کئی روز تک بری طرح کانپتے رہے۔''

مرزا محفوظ بیگ بتاتے ہیں کہ بچپن میں کبڈی کھیلنا اور گیدڑ کو دوڑانا اُن کے دو پسندیدہ کھیل تھے۔ مٹھو کے چچیرے بھائی اور قریبی ساتھی، محفوظ بیگ مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اسکول سے واپس آنے کے بعد مٹھو، چار دیگر لڑکوں کے ساتھ کسی گیدڑ کی تلاش میں نکل پڑتے اور جب وہ جانور مل جاتا، تو اسے اتنا دوڑاتے کہ وہ تھک جاتا، پھر یہ لوگ اسے پکڑ لیتے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ (سب سے بائیں) جامعہ کے اپنے دوستوں کے ہمراہ

زمانۂ تعلیم

بنیادی تعلیم دلوانے کے لیے مٹھو کا داخلہ انجان شہید، اعظم گڑھ کے مدرسہ اسلامیہ پاٹھ شالہ میں کرادیا گیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے مالٹاری، اعظم گڑھ کے گاندھی ہائی اسکول میں ایڈمیشن لے لیا۔

گاندھی ہائی اسکول مٹھو کے بڑے بھائی مرزا احسان اللہ بیگ کے ذہن کی پیداوار تھا، جنھوں نے اسکول کی تعمیر کے لیے ضروری سامان کا انتظام کرنے سے لے کر اس کا ڈھانچہ تیار کرنے تک میں پورا تعاون دیا۔

گاندھی ہائی اسکول، مالٹاری سے میٹری کولیشن پاس کرنے کے بعد، مٹھو اعظم گڑھ کے شبلی انٹر کالج میں داخل ہوگئے، جہاں سے انھوں نے بارہویں کلاس تک کی تعلیم مکمل کی۔

ایک دن شبلی انٹر کالج کے اساتذہ نے طلبہ کو ایک ڈاکیومینٹری دکھانے کا انتظام کیا۔ 'ہندوستان میں اقلیتیں' نام کی اِس ڈاکیومینٹری میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، اقلیتوں کے لیے اُن کا وژن اور

مسلمانوں کی ترقی میں تعلیم کے رول کو بہتر انداز میں دکھایا گیا۔

ڈاکیومینٹری دیکھنے کے بعد مٹھو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اُن کی اس بے چینی میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔

مٹھو جس سال اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے والے تھے، انھیں دنوں اپنے بڑے بھائی مرزا احسن اللہ بیگ کو انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بھائی سے درخواست کی کہ وہ انھیں دہلی بھیجنے کا انتظام کریں۔

مرزا احسان اللہ بیگ کو اپنے چھوٹے بھائی کی اس بڑی خواہش کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، کیوں کہ وہ خود بھی ایک سماجی کارکن، ماہر تعلیم اور انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے شخص تھے۔ مٹھو کو دہلی بھیجنے کے لیے انہوں نے سارے انتظامات کیے۔ یہی نہیں، مٹھو کا داخلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آسانی سے ہو جائے، اس کے لیے انہوں نے اُس وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ سی بی گپتا سے جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب کے نام ایک خط بھی لکھوایا۔

دہلی آنے سے پہلے ہی مٹھو نے اُن تمام عظیم شخصیات کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا تھا، جنھوں نے اپنی زندگی غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے علاوہ، جس دوسری شخصیت نے مٹھو کے ذہن و دل پر گہرے اثرات مرتب کیے، وہ پنڈت جواہر لعل نہرو تھے، جنھوں نے کوآپریٹو موومنٹ پر سب سے زیادہ زور دیا اور جو مشترکہ کوششوں کے ذریعہ ملک کو مضبوط بنانے اور اشتراکیت (کمیونزم) کے نظریہ کی بنیاد پر سماج میں انقلاب لانے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔

جامعہ مٹھو کے لیے تعلیم کا بہترین گہوارہ بنا۔ اساتذہ، کلاس فیلوز اور دوستوں کے ساتھ گہرے مراسم اور بطور ایک شہر، دہلی نے انھیں جو مواقع عطا کیے، ان کی مدد سے مٹھو نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کیا۔ جلد ہی وہ مٹھو سے مرزا فرید الحسن بیگ بن کر اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے۔

سینئر سیاسی لیڈر، سماجی کارکن اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قومی سکریٹری اتل کمار انجان

کے مطابق، مرزا فرید الحسن بیگ علم کی کھوج میں دہلی گئے اور وہاں میدانِ عمل میں کود پڑے۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ ''جامعہ سے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد صرف روزی روٹی کمانا ہی نہیں تھا، بلکہ جدید روایات اور ترقی پسند خیالات سے آشنا ہونا بھی تھا، جس کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کو علم و روشنی کا جدید گہوارہ بنانے میں اہم رول نبھایا تھا۔''

جھارکھنڈ سے رائے، جنھوں نے 1967، 1971 اور 1980 کے انتخابات میں جیت حاصل کرنے کے بعد بالترتیب چوتھی، پانچویں اور ساتویں لوک سبھا میں گھوسی کے محنت کش مزدوروں کی نمائندگی کی، ان کے جانشین کے طور پر 2014 کا لوک سبھا الیکشن لڑنے والے اتل کمار انجان مزید بتاتے ہیں کہ ''اس مشہور و معروف یونیورسٹی میں بیگ صاحب نے نہ صرف تعلیم حاصل کی، بلکہ گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خیالات و نظریات کو حقیقی شکل بھی فراہم کی۔''

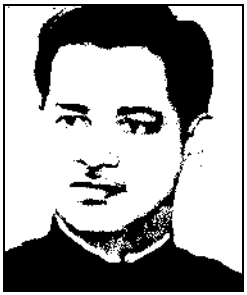

مقصدِ حیات کی تلاش

بچپن میں مٹھوا کثر اپنی ماں کو غریبوں اور یتیموں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا کرتے۔ وہ ذات پات اور مذہب ومسلک کی تمام دیواروں کو توڑتے ہوئے اپنے آس پاس کے درجن بھر یتیم بچوں کے کھانے کا انتظام خود کرتی تھیں۔ ان بچوں کا تعلق بنیادی طور پر دلت کنبوں سے تھا، جن کے ماں باپ وبائی امراض (مہاماری) پھیلنے کی وجہ سے اپنی جان نہیں بچا پائے اور اپنے پیچھے اِن بچوں کو روتا ہوا چھوڑ گئے۔

مرزا فرید الحسن بیگ اپنے والد کو بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا کرتے، جو غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے ہمیشہ جی توڑ محنت کرتے۔

بچپن میں ماں باپ کے ان کارناموں کا اثر مٹھو پر اتنا ہوا کہ وہ خود زندگی بھر غریبوں کے لیے بے چین رہے۔ وہ ہمیشہ اسی سوچ میں ڈوبے رہتے کہ کیسے سماج کے دبے کچلے اور غریبی کی مار جھیل رہے لوگوں کو خوشحال بنایا جائے، انھیں سر اٹھا کر جینا سکھایا جائے۔

دہلی آنے سے پہلے ہی مٹھو نے اُن تمام لوگوں کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا تھا، جو زندگی بھر غریبوں کے لیے کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے علاوہ، جس دوسری شخصیت نے مٹھو کے ذہن و دل پر گہرے اثرات مرتب کیے، وہ پنڈت جواہر لعل نہرو تھے، جنھوں نے کوآپریٹو موومنٹ پر سب سے زیادہ زور دیا اور جو مشترکہ کوششوں کے ذریعہ ملک کو مضبوط بنانے اور اشتراکیت (کمیونزم) کے نظریہ کی بنیاد پر سماج میں انقلاب لانے کے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔

ان لوگوں کے بارے میں تفصیلی جانکاری حاصل کرنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ سماج میں انقلاب لانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا، اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے، جس کی وکالت پنڈت جواہر لعل نہرو کرتے تھے۔ دوسرا، ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو طریقہ اپنایا تھا کہ ایجوکیشن، مالی مدد اور سماجی کاموں کے ذریعے غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔

انھوں نے کوآپریٹو موومنٹ اور سوشل وَرک کا مزید گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ایک طرف جہاں وہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے انہیں ایک مالی ادارہ کی ضرورت ہے، وہیں انہیں بڑے دل والے ایسے لوگوں کی بھی تلاش تھی، جو غریب افراد، کنبوں، گروہوں اور برادریوں کو انفرادی اور مجموعی طور پر خوشحال بنانے میں ان کی مدد کر سکیں۔

انھوں نے اس پر بھی غور کرنا شروع کیا کہ بنیادی طور پر اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ کیسے لوگوں کو ہنرمند اور اس لائق بنایا جائے کہ وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے خود اپنے وسائل کا استعمال کریں۔

مٹھو 1958 میں دہلی تشریف لائے۔ یہاں آ کر انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور 'سوشل ورک' کی پڑھائی شروع کر دی۔

انھیں دنوں ان کی نظر ایک کتاب پر پڑی، جس میں تاریخ کی 100 اہم ترین شخصیات کا ذکر کیا گیا تھا۔ کتاب کا نام تھا 'The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History'۔ یہ کتاب امریکی ایسٹروفزیشسٹ، مائیکل ایچ ہرٹ کی تصنیف کردہ ہے۔

پہلے ایڈیشن میں اس کتاب کی پانچ لاکھ کاپیاں چھپیں اور دنیا کی 15 زبانوں میں اس کے تراجم

شائع ہوئے۔ مائیکل ہرٹ نے اس کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو 100 لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا ہے اور انھیں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ سے بھی اونچا درجہ دیا ہے۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ہرٹ نے لکھا ہے کہ محمدؐ مذہبی اور سیکولر، دونوں میدانوں میں ''سب سے زیادہ کامیاب'' رہے۔ اس نے محمدؐ کے اس رول کی بھی تعریف کی ہے کہ آپؐ نے ایمان کی تقویت میں اچھے اخلاق کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرزا فرید الحسن بیگ کو جو بھی عقل وفہم حاصل ہوئی، اس نے ان کے ذہن پر دیرپا اثر ڈالا۔ ان کے روزمرہ کے برتاؤ میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہمدرد اور رحم دل بن گئے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرزا فرید الحسن بیگ کی سمجھ بوجھ پوری طرح اسلامی تعلیمات کے مطابق تھی، جس کا نمونہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق کے ذریعہ پیش کر چکے تھے۔

اللہ کو خوش کرنے کے لیے جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادتوں کا سلسلہ دراز کر دیا، تو اللہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ عبادت میں اعتدال پسندی اختیار کریں۔ اسی طرح، جب اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا معاملہ آیا اور آپؐ نے گھر میں پڑا سارا مال صدقہ کر دیا، تب بھی اللہ نے انھیں حکم دیا کہ صدقہ کرتے وقت اعتدال پسند رویہ اپنائیں۔

اس سلسلے کو آگے جاری رکھتے ہوئے اور اللہ کو خوش کرنے کے لیے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں اپنا سارا مال لٹا دیا اور اذیتیں برداشت کرنی شروع کر دیں، تو ایک بار پھر ان سے اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن، جب انھوں نے دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن اخلاق اور بہتر سلوک کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، تو اللہ نے نہ صرف ان کی تعریف کی، بلکہ ان کے اس عمل پر انھیں مبارکباد بھی دی۔

اب مرزا فرید الحسن بیگ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ خالق ومخلوق، دونوں کی نظر میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دو نہایت اہم اور بنیادی چیزیں یہی ہیں کہ انسانوں کی خدمت

اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔

اسی لیے اللہ میں پختہ یقین اور لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، ان کی زندگی کے دو رہنما اصول بن گئے۔ اس راہ میں ان کے سامنے کئی بار رکاوٹیں اور پریشانیاں آئیں، لیکن وہ اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہے اور ہر مشکل کام میں اللہ نے ان کی غیبی مدد کی۔

مرزا فرید الحسن بیگ (پہلی صف میں سب سے دائیں) اور پروفیسر محمد مجیب وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے ہمراہ

وطن سے پہلے کچھ نہیں

سال 1935 میں، جب اللہ رب العزت نے اس سرزمین پر خاص مشن کے ساتھ ایک انسان کو پیدا کیا اور اسے دوسرے انسانوں کی مدد کرنے اور انھیں تکلیفوں و پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے ایک ہمدرد دل اور بھرپور ہمت و حوصلہ عطا کیا، تو اس کے ساتھ ہی اس نے ان کے اندر حب الوطنی کا زبردست جذبہ بھی پیدا کیا۔ اس انسان کا نام مرزا فرید الحسن بیگ تھا، جسے پیار سے لوگ 'مٹھو' کہہ کر پکارتے۔ بچپن میں وہ ملک کے تئیں جس پیار و محبت کا اظہار کرتے اور جس طرح کے کارنامے انجام دیتے، اسے دیکھ کر ان کے تمام اعزاء و اقارب حیران رہ جاتے۔ ان کے والد مرزا رضا بیگ کے اندر بھی حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اور ان لوگوں کے لیے ایک سبق تھا، جو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں۔ وہ قومی رہنماؤں، مجاہدین آزادی اور اُن تمام لوگوں کا بہت احترام کرتے تھے، جنھوں نے اپنے ہر کام میں ملک کو فوقیت دی۔

ان کے گھر کی ایک اور خاموش ممبر، ان کی والدہ تھیں، جو نہ صرف غریبوں کے لیے ایک بڑا دل

رکھتی تھیں، بلکہ انھوں نے اپنے بیٹے کو ہندوستان کے اُن تمام بڑے لیڈروں کی کہانیاں بھی سنا رکھی تھیں، جنھوں نے وطن عزیز کے مفادات کی حفاظت کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔

چونکہ والد کا سایہ اُن کے سر سے تبھی اٹھ گیا تھا، جب مرزا فرید الحسن بیگ صرف پانچ سال کے تھے، اس لیے والد کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بڑے بھائی، مرزا احسن اللہ بیگ کے سر آئی۔ مرزا احسان اللہ بیگ ایک ماہر تعلیم، قوم پرست اور عدم تشدد کے پجاری تھے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، اشفاق اللہ خان، مولانا ابوالکلام آزاد، سر سید احمد خاں اور بدرالدین طیب جی وغیرہ اُن کے آئڈیل رہنما تھے۔ خود مرزا احسان اللہ بیگ بھی ایک مجاہد آزادی تھے، جنھوں نے دوسرے قوم پرست لیڈروں کے ساتھ ہندوستانی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس (آئی این سی) نے 1985 میں اپنی صد سالہ تقریب کے موقع پر مرزا فرید الحسن بیگ کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ انھیں اعزاز سے نوازا جائے، کیوں کہ اعظم گڑھ خطے میں پارٹی کیڈر کو مضبوط کرنے اور لوگوں کو کانگریس میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرنے میں انھوں نے اہم رول نبھایا تھا۔

ممبئی میں صد سالہ تقریب منعقد ہونے سے قبل، وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کی نظر اپنی والدہ شریمتی اندرا گاندھی کی ذاتی ڈائری پر پڑی، جس میں مرزا احسان اللہ بیگ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان کا نام کانگریس کے بہی خواہوں کی فہرست میں شامل تھا، جنھوں نے پارٹی کی بے لوث خدمت کی، گاندھی وادی نظریہ کو اپنایا اور اپنے وطن کو دیگر تمام چیزوں پر ترجیح دی۔ جناب راجیو گاندھی کے اندر مرزا احسان اللہ بیگ کے بارے میں مزید جاننے کا تجسس پیدا ہوا اور انھیں پتہ چلا کہ مرزا احسان اللہ بیگ نے کانگریس پارٹی کو آگے بڑھانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔

ان کے کارناموں اور خدمات کا اعتراف کرنے کے علاوہ، کانگریس پارٹی نے مرزا احسان اللہ بیگ کو 71-1970 میں اعظم گڑھ کے ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیئرمین بنا دیا۔ مرزا احسان اللہ بیگ چونکہ تعلیم کے ذریعہ اعظم گڑھ خطہ کی ترقی کا ایک وسیع خاکہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے، لہٰذا بہت کم عرصے میں ہی انھوں نے وہاں کی اقلیتوں کے درمیان تعلیم کو فروغ دینے کے مقصد سے 70 پرائمری اسکول قائم

کیے۔ان کا انتقال 1986 میں ہوا،لیکن سماج کے کمزور اور غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ آج بھی ان کے کارناموں کو یاد کر کے ان کی تعریف کرتے ہیں۔آج، جب کہ ان کے انتقال کو 29 سال گزر چکے ہیں، پھر بھی لوگ مرزا احسان اللہ بیگ کو یاد کرتے ہیں، جنھوں نے اعظم گڑھ خطے کی ترقی کے لیے کام کیا اور پس ماندہ لوگوں، خاص کر اقلیتی طبقہ کے افراد کو اونچا اٹھانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

ایک متجسس طالب علم اور گہرے مشاہد کے طور پر، مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنے اہل خانہ سے بہت سی چیزیں سیکھیں اور مادرِ وطن کے تئیں گہرے لگاؤ اور ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کیا۔ موہن داس کرم چند گاندھی کے عدم تشدد کے نظریہ 'اہنسا' سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے اور جب کبھی اُن کے سامنے یہ چیلنج آیا کہ ملک اور ذاتی مفاد میں سے کس کا انتخاب کیا جائے، تو انھوں نے ملکی مفاد کو ہی باقی چیزوں پر ترجیح دی۔

گاندھی وادی ہونے کی وجہ سے وہ تا عمر امن کے نظریہ پر قائم و دائم رہے اور ملکی مفاد کو سب سے اوپر رکھا۔قومی تہواروں کے موقع پر ترنگا لہرانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ملک کے احترام و وقار کی نشانی کے طور پر وہ کھادی کرتا پائجامہ اور نہرو ٹوپی پہنا کرتے تھے۔

اتل کمار انجان کے مطابق، مرزا صاحب گاندھی وادی فلسفہ کے اصلی نمائندہ تھے۔سی پی آئی (ایم) کے قومی سکریٹری، اتل کمار انجان مزید بتاتے ہیں کہ ''اگر اس ملک کے شہریوں میں سے کسی نے ہندوستانی آئین پر پابندی سے عمل کیا ہے، تو میرے خیال سے مرزا فرید الحسن بیگ اس کی انوکھی مثال ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی آئین کے مطابق گزاری۔انھوں نے ایک ہندوستانی اور ایک سچے مسلم کا کردار پیش کیا۔ان کا دل پیار و محبت، قربانی اور حب الوطنی کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔''

نئی دینا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ایک بار مرزا صاحب نئی دنیا اخبار میں جامعہ سے متعلق کچھ چھپوانے کے لیے میرے دفتر تشریف لے آئے۔پہلی نظر میں ہی وہ پوری طرح ایک سیکولر انسان نظر آئے۔ان کے اندر ذرہ برابر بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی، جسے دیکھ کر یہ لگتا ہو کہ وہ ہندوستانی نہیں ہیں۔میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ آپ اگر ہندوتوا کے کسی کٹر پیروکار سے

ملیں اور اسے متعدد آسانیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اسے امریکہ میں سکونت اختیار کرنے کی پیشکش کریں، تو وہ فوراً حامی بھر لے گا اور ملک چھوڑ کر وہاں چلا جائے گا۔ لیکن، مرزا صاحب نے نہ تو خود پاکستان جانے کا ارادہ کیا اور نہ ہی کبھی اپنے بچوں کو امریکہ میں آباد کرنے کا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے یہ کام کر سکتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو ہندوستان میں ہی رکھنا چاہتے تھے، تاکہ وہ پورے جذبہ و لگن سے اپنے ملک کی خدمت کر سکیں۔''

انھوں نے مزید بتایا کہ ''دل سے وہ ایک ہندوستانی تھے اور کردار سے ایک سیکولر انسان۔ میں نے ان کے منھ سے کسی مذہب یا مسلک کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ وہ ہر کسی کی مدد کرنا چاہتے تھے، چاہے وہ مسلمان ہو یا پھر کسی اور مذہب کا ماننے والا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر کوئی ایک باوقار زندگی گزارے اور اس کے لیے وہ ہر مدد دینے کو ہمیشہ تیار رہتے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک انسانیت نواز شخص تھے۔''

قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے سابق چیئر مین، جسٹس ایم ایس اے صدیقی کے مطابق، ہندوستانی عدلیہ میں مرزا صاحب کا بھروسہ اور ملک سے محبت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کیس میں مضبوط فیصلہ سنانے میں ان کی مدد کی۔ جسٹس صدیقی بتاتے ہیں کہ ''مجھے لالچ دی گئی کہ اگر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خلاف فیصلہ سناؤں اور اسے اقلیتی ادارہ ہونے کا درجہ نہ دوں، تو ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے کوئی بڑا عہدہ سونپا جائے گا، راجیہ سبھا کی سیٹ دی جائے گی اور اس کے علاوہ مزید سہولیات بھی مجھے عطا کی جائیں گی۔ یہ پیشکش برسر اقتدار پارٹی کے ایک نہایت سینئر لیڈر کی طرف سے میرے پاس آئی۔ اسی زمانے میں مرزا صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے صحیح فیصلہ سنانے کی درخواست کی۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنی پوری مدتِ کار کے دوران میں اپنے پیشہ کے تئیں ایماندار اور سچائی کے راستے پر چلنے والا رہا ہوں۔ اگر حالات جامعہ کے حق میں ہیں، تو میں اسے اقلیتی ادارہ ہونے کا فیصلہ سنانے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے دل کی بات سنی اور کیس کے میرٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اقلیتی ادارہ قرار دے دیا۔''

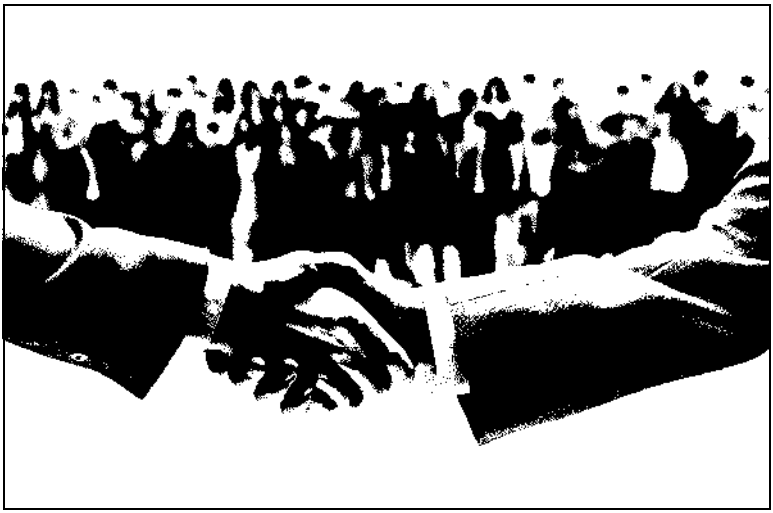

کوآپریٹوموومنٹ: ایک جائزہ

1947 میں انگریزوں کی غلامی سے آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان میں کوآپریٹوسوسائٹیز کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے، خاص کر اس نے زرعی شعبہ کی بڑے پیمانے پر مدد کی ہے۔

مثال کے طور پر، ہندوستان میں چینی پیدا کرنے والی جتنی بھی ملیں ہیں، وہ سبھی ملیں مقامی کوآپریٹوسوسائٹیز کی ملکیت ہیں۔ دوسری طرف، ان کوآپریٹوسوسائٹیز کے ممبر وہ سبھی چھوٹے اور بڑے کسان بھی ہیں، جو اِن ملوں کو گنے سپلائی کرتے ہیں۔

یہ کوآپریٹوسوسائٹیز ڈیئری (دودھ اور اس سے متعلق اشیاء کی پیداوار کی) مارکیٹنگ اور بینکنگ میں بھی بڑا رول ادا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے کوآپریٹو بینک دیہی اور شہری، دونوں معاشروں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ورگیس کورئن نے اپنی کتاب ''میرا بھی ایک خواب تھا'' (I too had a Dream) میں اُن تمام مسائل، ان کے حل اور تجربات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، جن کا سامنا انھیں 'امول' کے نام سے مشہور ڈیئری کوآپریٹوسوسائٹی کی تشکیل وتعمیر میں کرنا پڑا۔

ہندوستان میں کوآپریٹو موومنٹ کی پیش رفت کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد مرزا فرید الحسن بیگ آخر کار اسی نتیجہ پر پہنچے کہ سماج میں انقلاب لانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا، اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے، جس کی وکالت پنڈت جواہر لعل نہرو کرتے تھے۔ دوسرا، ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو طریقہ اپنایا تھا کہ ایجوکیشن، مالی مدد اور سماجی کاموں کے ذریعے غریبوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔

انھوں نے کوآپریٹو موومنٹ اور سوشل وَرک کا مزید گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ایک طرف جہاں وہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ غریبوں کو پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے انہیں ایک مالی ادارہ کی ضرورت ہے، وہیں انہیں بڑے دل والے ایسے لوگوں کی بھی تلاش تھی، جو غریب افراد، کنبوں، گروہوں اور برادریوں کو انفرادی اور مجموعی طور پر خوشحال بنانے میں ان کی مدد کر سکیں۔

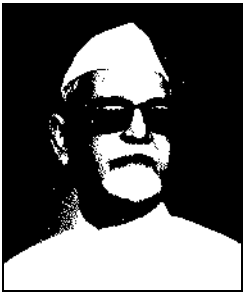

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نامکمل مشن

پس ماندوں، خاص کر جدوجہد کرتی اقلیتوں کو تعلیم، گھر اور اقتصادی خودمختاری عطا کرنا ڈاکٹر ذاکر حسین کا نامکمل مشن تھا۔ چونکہ معاشرے کے دبے کچلے اور محروم لوگوں کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا جو درد تھا، وہی درد مرزا فرید الحسن بیگ کا بھی تھا، اس لیے انھوں نے ذاکر حسین کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔

غریبوں کو گھر فراہم کرنے کے لیے مرزا فرید الحسن بیگ نے جنوبی دہلی میں ایک رہائشی کالونی بنانے کے بارے میں سوچا، جو ایک ریگولرائزڈ کالونی کی طرح ہی تمام سہولیات سے آراستہ ہو۔ کوآپریٹو سوسائٹی کو عطا کی گئی سہولیات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنی سوسائٹی کے رجسٹریشن کے لیے رہائشی کوآپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار سے رابطہ کیا۔

سوسائٹی سے وابستہ تمام اراکین سے صلاح ومشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سوسائٹی خود ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام پر درج ہونی چاہیے اور اسی مناسبت سے اس کالونی کا نام ذاکر باغ رکھا جانا

چاہیے۔ رجسٹریشن سے متعلق پہلے مرحلہ کو ہی پورا کرنے میں تقریباً 11 سال (1973-1984) لگ گئے۔ اب دوسرا مرحلہ تھا خطۂ اراضی کو الاٹ کروانا اور یہ بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔

حکومت کی طرف سے جو پہلا جواب ملا، وہ بہت منفی تھا۔ اس نے خطہ اراضی جاری کرنے کے معاملے کو التوا میں ڈال دیا تھا۔ کافی محنت و کوشش اور پریشانیوں کے بعد سرائے جولینا گاؤں کے قریب زمین کے ایک ٹکڑے کی پہچان کی گئی۔ لیکن، وہاں کے مقامی باشندوں نے اس میں رکاوٹ ڈالنی شروع کر دی، حالانکہ یہ لوگ غیر قانونی طریقے سے سرکاری زمین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی دیکھتے تھے کہ وہ زمین ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی، تو ہنگامہ اور بدمعاشیاں کرنا شروع کر دیتے تھے۔

کافی جدوجہد کے بعد آخر کار وہ زمین سوسائٹی کو الاٹ کر دی گئی۔ اب تیسرا مرحلہ یہ تھا کہ کیسے ایک تعمیراتی خاکہ تیار کیا جائے، تاکہ پوری کارروائی حکومتی ضابطوں کے مطابق ہو۔ اور اس کے لیے سوسائٹی کو ایک ایسے قابل معمار (آرکی ٹیکٹ) کی ضرورت تھی، جو اِس کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔

بیگ صاحب نے اپنی دور اندیشی کا استعمال کرتے ہوئے اس کام کے لیے ہندوستان کے اس زمانے کے مشہور و معروف آرکی ٹیکٹ راج ریوال کی خدمات حاصل کیں، جو پوری دنیا میں ایسی عمارتیں بنانے کے لیے اپنی انوکھی شناخت رکھتے تھے، جو تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری آبادی، ماحولیات اور کلچر کے مطالبات کے عین موافق ہو۔

ایک ایسے ملک میں، جو ترقی پذیر بھی ہو اور صنعت یافتہ بھی، جہاں پر قدیم عمارتیں بھی پائی جاتی ہوں اور نئی بھی اور جہاں کا معاشرہ قدامت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ تکثیری بھی ہو، وہاں پر ریوال کا کام جدید ٹکنالوجی اور تاریخ اور اس کے پس منظر کا آمیزہ ہے اور انھوں نے نہ صرف اس کا بہترین ڈیزائن تیار کیا، بلکہ اس میں مقامی سطح پر ملنے والے بہترین سامانوں کا بھی استعمال کیا، جس سے ان عمارتوں کو ایک نئی پہچان ملی۔

بیگ صاحب نے راج ریوال کو اس کام میں کیوں لگایا، اس کے پیچھے جہاں کئی اسباب ہیں،

ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے دہلی اور لندن سے تعلیم حاصل کی تھی اور نئی دہلی میں اپنا کام شروع کرنے سے پہلے وہ ایکوچارڈس کے پیرس میں واقع دفتر میں بھی کام کر چکے تھے۔ انھیں بہت سے انعامات واعزازات سے نوازا گیا، جن میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف آرکی ٹیکٹس سے گولڈ میڈل اور کامن ویلتھ ایسوسی ایشنز آف آرکی ٹیکٹس سے حاصل کیا گیا رابرٹ میتھو ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

وہ صحیح معنوں میں ان ایوارڈس کے حقدار تھے، کیوں کہ ذاکر باغ کی شکل میں انھوں نے جو شاہکار بنایا، جلد ہی تعمیری حلقوں میں اس کی چرچا ہونے لگی۔ پورے ملک میں انجینئرنگ اور آرکی ٹیکچر ڈیزائننگ کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بڑی تعداد میں اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے، کیوں کہ آرکی ٹیکچر اور ٹکنالوجی کا یہ بہترین امتزاج ہے۔

راج ریوال کے ذریعے چار کروڑ کی لاگت سے بننے والی اور 204 یونٹوں والی یہ خوبصورت کالونی 1984 میں بن کر تیار ہوگئی۔ چونکہ اس رہائشی پروجیکٹ کا خاکہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت سے متاثر ہوکر تیار کیا گیا تھا، لہٰذا انھیں نذرانہ پیش کرتے ہوئے اس کا نام 'ذاکر باغ' رکھا گیا۔

ایک ایسے باغ کی طرح، جس میں طرح طرح کے پیڑ پودے لگے ہوں، ذاکر باغ میں بھی طرح طرح کے لوگوں کو بسایا گیا، جن میں ماہرین تعلیم سے لے کر، انجینئر، نوکر شاہ، وکیل، ڈاکٹر اور کاروباری تک، سبھی شامل تھے۔ یہ بیگ صاحب کی بڑی کامیابیوں میں سے ایک تھی۔

انجینئر شبیہ الحسن، جو کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ سے ریٹائر ہوئے، اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''میں مرزا فرید الحسن بیگ سے 1960 میں اس وقت ملا، جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اوکھلا میں ہمیں رہائشی مکانات کی زبردست قلت درپیش تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد یہی ایک کامیاب کوآپریٹو سوسائٹی تھی، حالانکہ اور بھی کئی سوسائٹیز بنیں، لیکن وہ سب بری طرح ناکام رہیں۔ مجھے جو چیز مرزا صاحب کے قریب لائی، وہ ان کی معتبریت اور غریبوں کے تئیں ان کے اندر بے لوث خدمت وقربانی کا جذبہ تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کوآپریٹو سوسائٹی کے رکن بن جائیں، جسے انھوں نے بخوشی قبول

کرلیا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اگر مرزا صاحب نہ ہوتے، تو میں جنوبی دہلی کے وسط میں گھر ہرگز نہیں خرید پاتا۔''

شبیہ الحسن نے مزید بتایا کہ ''ضرورت مندوں اور پس ماندہ لوگوں کے لیے انھوں نے جو پروجیکٹ شروع کیا تھا، اس کے بارے میں وہ اتنے فکرمند رہا کرتے تھے کہ بستر مرگ پر آخری سانس لینے سے پہلے بھی انھوں نے یہ پوچھا تھا کہ ذاکر باغ کا سرٹیفکیٹ مکمل ہو پایا ہے یا نہیں۔ ذاکر باغ کے کاغذات کو صحیح ڈھنگ سے تیار کرنے اور سرٹیفکیٹ کی تکمیل سے متعلق میری کوششوں کی انھوں نے کافی تعریف کی تھی۔''

پروفیسر اسد علی کے مطابق، مرزا صاحب کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے لیے گھر کا انتظام کیا، بلکہ انھوں نے جنوبی دہلی کے بیچوں بیچ ان 200 لوگوں کے لیے بھی گھر کا انتظام کیا، جو ایک محفوظ اور بہتر مکان کی تلاش میں تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ''دراصل، ذاکر باغ اس کوآپریٹو سوسائٹی کی دین ہے، جسے پنڈت جواہر لعل نہرو کے سوشلسٹ نظریہ سے متاثر ہوکر اوران کے کوآپریٹو موومنٹ سے سبق لے کر قائم کیا گیا تھا۔ ایک رہائشی سوسائٹی کے لیے وسائل کا انتظام کرنا کافی مشکل کام تھا۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ممبران کے انتخاب میں مرزا صاحب نے کافی دوراندیشی سے کام لیا۔ اسی لیے انھوں نے قصداً سوسائٹی کے ممبران کے طور پر چند بڑے ناموں اور متمول افراد کا انتخاب کیا۔''

این ایس ایسوسی ایٹس کے ڈائریکٹر، دیویندر راوت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''جس وقت ذاکر باغ کی تعمیر کا کام چل رہا تھا، اس وقت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ انوکھی طرزِ تعمیر کی وجہ سے ذاکر باغ کے آرکی ٹیکچر کی پورے شہر میں چرچا ہونے لگی۔ اس سلسلے میں جب میں بیگ صاحب سے ملا، تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ذاکر باغ کا پورا آرکی ٹیکچر کسی اور نے نہیں، بلکہ معروف معمار راج ریوال نے تیار کیا ہے، جو قدرت کے ساتھ جدید ٹکنالوجی کا تال میل بٹھانے میں مہارت کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ انھوں نے اس کی ساخت مسلم معاشرے میں پردے کی روایت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بنائی اور ایسا کرتے وقت انھوں نے تعمیراتی خوبصورتی سے بھی

کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ آپ اپنی کھلی اور ہوادار بالکونی میں بیٹھ کر قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔''

مرزا صاحب کے قریبی دوست، انجینئر احمد سعید بتاتے ہیں کہ رہائشی کالونی کے طور پر ذاکر باغ کیسے وجود میں آیا۔'' کچھ لوگوں نے کسانوں کی زمین خریدی اور ذاکر باغ بنانا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ہمیں بھی ایک گھر کی ضرورت تھی۔ چونکہ حکومت نے اس وقت ہاؤسنگ سوسائٹیز کو منظوری دینا بند کر دیا تھا اور زمینیں صرف غیر منظور شدہ علاقوں میں ہی دستیاب تھیں، اس لیے ہم سب کافی پس وپیش کی حالت میں تھے۔ ہم نے اس سلسلے میں مرزا صاحب سے بات کی، لہٰذا انھوں نے ہم سے مزید لوگوں کو تیار کرنے کے لیے کہا، تاکہ مستقبل میں اگر کوئی سوسائٹی بنتی ہے، تو وہ اس کے ممکنہ ممبر بن سکیں۔

''وہ تاریخ 31 اکتوبر، 1971 تھی، جب کچھ لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے 10 روپے کی فیس اور 100 روپے کے شیئر کے ساتھ ایک گروپ بنایا۔ ہماری پہلی میٹنگ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سوشل ورک ڈپارٹمنٹ میں ہوئی۔ انھیں دنوں ہم نے رہائشی مکانوں کے لیے زمین کی قلت، خاص کر دہلی کے اقلیتی طبقوں سے متعلق، ایک مضمون پڑھا، جو ہندوستان ٹائمز کے 'ایوننگ نیوز' میں شائع ہوا تھا۔ اسی مضمون میں اندر کمار گجرال کا وہ بیان بھی شامل تھا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اقلیتوں کو اگر زمین چاہیے، تو انھیں ایک کوآپریٹو سوسائٹی بنانی چاہیے۔

''یہ ہمارے لیے کافی مددگار ثابت ہوا۔ اس وقت مسٹر جھا کے نام سے ایک شخص تھے، جو رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی (آر سی ایس) کے عہدہ پر فائز تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کے مؤقف اور اخبار میں چھپے ان کے وزیر کے بیان میں کافی تضاد ہے۔

''میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ چونکہ ہمارا تعلق اقلیتی طبقہ سے ہے، اس لیے ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسٹر جھا نے ہم سے وزارت سے رابطہ کرنے کے لیے کہا، لہٰذا ہم نے وہاں جا کر مسٹر آئی کے گجرال سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ہم جب وہاں گئے، تو ہماری ملاقات مسٹر اوم مہتہ سے ہوئی، کیوں کہ گجرال صاحب کا کہیں

اور ٹرانسفر ہو گیا تھا اور ان کی جگہ اوم مہتہ نے لے لی تھی۔ ہم نے اُن سے اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتایا، جس کے جواب میں انھوں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے سوسائٹیز کے رجسٹریشن کا دروازہ کھول دیا۔ ہم نے درخواست دی، لہٰذا بعض لازمی شرائط اور بنیادی کارروائیوں کو مکمل کرنے کے بعد 1972 میں ہمیں سوسائٹی رجسٹریشن سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا۔

''سوشل ورک کے ہمارے استاد، اے آر سید اور ان کی اہلیہ، دونوں نے ہمیں پڑھایا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں ان سے بھی رائے طلب کی۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے علاقہ کے رکن پارلیمنٹ (ایم پی) ششی بھوشن کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ زمین الاٹمنٹ کے لیے ہمارے کیس کی سفارش کر دیں۔

''اس کے بعد ہم نے ایک جوائنٹ میمورنڈم تیار کر کے اُس پر دہلی کے سبھی 7 ممبرانِ پارلیمنٹ کے دستخط کرانے کے بارے میں سوچا۔ چونکہ میں ایک انجینئر تھا، لہٰذا میں نے دہلی کا ماسٹر پلان اور ساتھ ہی اس کا ژونل پلان بھی تیار کیا اور اپنی سوسائٹی کے لیے زمین تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''ہم نے یہ لیٹر وزارت کو دیا۔ بھولا پاسوان نئے ہاؤسنگ کمشنر تھے۔ ان تک کیسے پہنچا جائے، اس کے لیے ہم نے ایک حکمت عملی بنائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی صاحبزادی، سعیدہ آپا کو اپنے ساتھ لے کر بھولا پاسوان سے ملنے پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب بہار کے گورنر تھے، تو اس وقت بھولا پاسوان اُن سے کئی بار ملاقات کر چکے تھے اور ان کی شخصیت سے بھی کافی متاثر تھے۔ سعیدہ آپا کو دیکھ کر انھوں نے ہم سے بات کی اور ہماری تشویش پر ہمدردی کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس فائل کو پاس کر دیا، جس کے بعد ہمیں ایک خط موصول ہوا، جس میں کہا گیا تھا کہ سوسائٹی کو زمین دی جا سکتی ہے۔ ہم نے زمین حاصل کرنے کے لیے کافی جدوجہد کی۔ آخر کار سرائے جولینا کے پاس 14.25 ایکڑ زمین کا ٹکڑا ہمیں الاٹ کر دیا گیا۔

''اس کے بعد ہم نے سب سے پہلے ایچ ڈی ایف سی بینک کے چیئرمین، ایچ ٹی پاریکھ سے رابطہ کیا کہ وہ ہمارے پروجیکٹ کو فائننس کریں، لیکن بینک نے منع کر دیا۔ مرزا صاحب کی درخواست پر، انھوں نے پروجیکٹ کی جگہ کا ذاتی دورہ کیا، جہاں ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اور دل کھول

کر مہمان نوازی کی گئی۔ ہماری مہمان نوازی، دوستانہ برتاؤ اور سنجیدگی کو دیکھ کر ایچ ٹی پاریکھ کافی متاثر ہوئے اور پروجیکٹ کو فائنس کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس وقت کے جانے مانے آرکی ٹیکٹ (معمار) راج ریوال کو آرکی ٹیکچرل پلان تیار کرنے پر مامور کیا گیا، جسے انھوں نے نہایت خوبصورتی اور مؤثر طریقے سے انجام دیا اور اس طرح کچھ دنوں بعد 204 مکانوں پر مشتمل ذاکر باغ بن کر تیار ہو گیا۔''

زرینہ بھٹی کے مطابق، ذاکر باغ تیار کرنے اور جامعہ کو آپریٹو بینک قائم کرنے میں مرزا صاحب نے جس بے لوث کارکردگی کا مظاہرہ کیا، تاریخ میں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ زرینہ بھٹی مزید کہتی ہیں، ''انھوں نے دوسروں کے لیے جو کام شروع کیے، جب ان کے کاغذات تیار کرنے کا وقت آیا، تو انھیں اس کے بارے میں بہت زیادہ جانکاری نہیں تھی، لیکن وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ اس کام کو کرنے کے لیے سب سے بہتر شخص کون ہو سکتا ہے۔ انھوں نے میرے شوہر مرحوم آئی زیڈ بھٹی سے رابطہ کیا، جو کہ ایک ماہر اقتصادیات تھے اور جانتے تھے کہ کاغذات ٹھیک سے کیسے تیار کیے جاتے ہیں۔ مرزا فرید الحسن بیگ کا دوستانہ برتاؤ اور مہمان نوازی نے ان کا دل جیت لیا، جس کی وجہ سے دونوں میں خوب بننے لگی۔ اس طرح مرزا صاحب کو کوآپریٹو بینک بنانے کے لیے بہترین مشورہ مل گیا اور ساتھ ہی میرے شوہر نے اس کے لیے ٹھیک طرح سے کاغذات تیار کرنے میں بھی ان کی خوب مدد کی۔''

زرینہ بھٹی مزید بتاتی ہیں کہ ''لوگوں کے ساتھ مراسم بنانے میں جب بیگ فیملی کی مہمان نوازی، فراخدلی اور میل ملاپ بڑھانے کی بات آتی ہے، تو میرے پاس بیان کرنے کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، کیوں کہ مہمانوں پر اتنا دل کھول کر مہربان ہونے اور پیار و محبت جتانے کی مثال میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ، دوسروں کی مدد کے لیے وہ ہر وقت جس طرح تیار رہتے ہیں، اس کی وجہ سے فیملی کے ممبران کا ہر کوئی احترام کرتا ہے۔ یہی نہیں، ان کی حسن اخلاق اور جذبہ ایثار اپنی زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں بھی انھیں اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔''

جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

رشتہ یقین کا

حیدرآباد کے اپنے ایک سفر کے دوران، حسب معمول مرزا صاحب ایک آٹو رکشہ ڈرائیور کے ساتھ بات کرنے لگے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیسے گزر بسر کرتا ہے اور ایک مہینہ میں کتنا کما لیتا ہے۔ رکشہ ڈرائیو نے فخریہ لہجہ میں کہا کہ وہ ڈرائیور نہیں ہے، بلکہ اس آٹو رکشہ کا مالک ہے۔

مرزا صاحب نے اس سے سوال کیا کہ ''تم نے اس رکشہ کو خریدنے کے لیے پیسے کا انتظام کہاں سے کیا؟'' جواب میں رکشہ والے نے کہا کہ ''ہماری ریاست میں کوآپریٹو سسٹم چل رہا ہے، جس کی وجہ سے ہمیں کوآپریٹو بینک سے آسان شرطوں پر قرض مل جاتے ہیں۔ چند سالوں کے بعد ہم قرض کا وہ پیسہ بینک کو لوٹا دیتے ہیں اور مالک بن جاتے ہیں۔''

یہ بات چیت مرزا صاحب کے اندر جل رہی اُس چنگاری کو شعلہ بنانے میں کافی کارگر ثابت ہوئی، جس کے تحت وہ مالی اعتبار سے کمزور لوگوں کو بااختیار بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے میں لگے

ہوئے تھے۔ حیدرآباد سے واپسی کے بعد، انھوں نے اپنے اُن قریبی دوستوں سے اس موضوع پر بات کی، جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ صحیح مشورہ دیں گے۔

آخر کار، تمام پریشانیوں پر قابو پاتے ہوئے، جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ (جے سی بی) نے 1995 سے کام کرنا شروع کر دیا۔ آج وہ پورے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ بہترین کوآپریٹو بینکوں میں سے ایک ہے۔ اس کے پاس 152 کروڑ کا ڈِپوزٹ بزنس اور 84 کروڑ کی اضافی رقم موجود ہے۔

آج اگر ہم جے سی بی کی حصولیابیوں پر نظر ڈالیں، تو اس نے ایسے بے انتہا لوگوں کو قرض دیے ہیں، جو اپنی دو وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اسی طرح جامعہ کوآپریٹو بینک نے ان لوگوں کو قرض دیا، جو چھوٹا موٹا کوئی کاروبار شروع کر کے اپنی زندگی کو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ عورتوں کو بااختیار بنانے اور اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے انھیں ہنرمند بنایا، انھیں گاڑیاں خریدنے کے لیے قرض دلوائے، تاکہ ان کی زندگیاں بھی بدلیں اور وہ خوشحالی کی زندگی جی سکیں۔

جے سی بی نے پڑھنے والے بہت سے بچوں کو اپنی تعلیم جاری رکھنے اور اپنی فیملی کا مقدر بدلنے میں بھی ان کی مدد کی۔ مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنے دوست انجینئر احمد سعید سے یہ بات کہی تھی کہ ''کسی بھی بچے کو صرف اس لیے تعلیم سے دور نہ رکھا جائے کہ اس کے ماں باپ پڑھائی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے۔ اسے تعلیم یافتہ بنانا اُن لوگوں کی ذمہ داری ہے، جنہیں خدا نے ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے مالا مال کیا ہے۔ ہمارے سماج کو آگے بڑھ کر تعلیم کے میدان میں مدد کرنے کی ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر ذاکر حسین کی پوتی اور جامعہ کوآپریٹو بینک کی ڈائریکٹر، ریحانہ مشرا کے مطابق، کمزور طبقوں اور خاص کر مسلمانوں کے لیے مالیاتی لائف لائن تیار کرنے میں مرزا صاحب نے قابل تعریف کام کیا۔ بقول ریحانہ مشرا، ''مرزا فرید الحسن بیگ صحیح معنوں میں ایک انسانیت نواز شخص تھے، جنھوں نے کمزور طبقوں کی زندگی بدلنے کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ اپنا خود کا کاروبار

شروع کرنے کے لیے بے شمار لوگوں نے جامعہ کوآپریٹو بینک سے قرض (لون) لیے اور آج وہ مالی اعتبار سے خود مختار ہو کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، لاتعداد لوگوں نے اپنے بچوں کے لیے بینک سے ایجوکیشن لون لیے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آج یہ بچے یا تو کہیں اچھی نوکری کر رہے ہیں یا پھر انھوں نے اپنا کوئی کاروبار شروع کر دیا ہے، اس طرح ان تمام لوگوں کی زندگی میں اس بینک کی وجہ سے بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور وہ سر اٹھا کر جینے کے لائق بنے۔ یہ سارے لوگ آج خوش ہیں اور ایک بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔'' ایک مشترکہ بات چیت کے دوران ریحانہ مشرا کی بہن، نیلوفر مینن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

مرزا فرید الحسن بیگ کے سالے، ظفر خان، جو امریکہ میں رہتے ہیں، بتاتے ہیں، ''مرزا صاحب جب جامعہ کوآپریٹو بینک بنا رہے تھے، تو اُن دنوں وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس ایک صلاح کار ہے، جو امریکہ میں رہتا ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ لوگوں سے کام کیسے لینا ہے اور اپنے مقصد کو کس طرح حاصل کرنا ہے۔ وہ ایک دور اندیش انسان تھے۔ انھوں نے بینک، ذاکر باغ کی تعمیر اور اعظم گڑھ میں تعلیمی ادارے قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مشن کے پکے ہیں۔ ان کے اندر انسانی برتاؤ کو سمجھنے کی بہترین صلاحیت موجود تھی۔''

قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی جات (این سی ایم اے آئی) کے سابق چیئرمین، جسٹس ایم ایس اے صدیقی، مرزا فرید الحسن بیگ کے ساتھ اپنی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''مرزا صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے جامعہ کوآپریٹو بینک کی ایک برانچ کا افتتاح کرنے کی گزارش کی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی، لیکن جب انھوں نے یہ کہا کہ یہ بینک سماج کے غریب اور کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے، تو میں نے غریبوں کے تئیں ان کے بے لوث جذبے کو دیکھتے ہوئے حامی بھر دی۔ اللہ کے شکر سے اُس برانچ نے اتنی ترقی کی کہ آج اس کے بڑی تعداد میں اکاؤنٹ ہولڈر (کھاتہ دار) ہیں۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، محمود الرحمٰن نے کہا کہ ''مرزا قمر الحسن بیگ نہایت فعال اور قابل شخص ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ نہ صرف جامعہ کوآپریٹو بینک کو نئی بلندیوں تک لے جائیں گے، بلکہ جلد ہی مرزا صاحب کے ادھورے خوابوں کو بھی پورا کریں گے۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں غالب کا مجسمہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پیار

مرزا فرید الحسن بیگ نے جب سے ماہرین تعلیم، خاص کر سرسید اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی زندگیوں کا مطالعہ کیا، وہ بے چین ہو گئے اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کرنے کی ان کی خواہش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

ایک دن شبلی انٹر کالج کے اساتذہ نے طلبہ کو ایک ڈاکیومینٹری دکھانے کا انتظام کیا۔ 'ہندوستان میں اقلیتیں' نام کی اِس ڈاکیومینٹری میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، اقلیتوں کے لیے اُن کا وژن اور مسلمانوں کی ترقی میں تعلیم کے رول کو بہتر انداز میں دکھایا گیا۔

ڈاکیومینٹری دیکھنے کے بعد مٹھو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اُن کی اس بے چینی میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔

مٹھو 1958 میں دہلی تشریف لائے۔ یہاں آ کر انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور 'سوشل ورک' کی پڑھائی شروع کر دی۔ انھوں نے سوشل ورک میں اپنی تعلیم مکمل کی اور 'انسانیت کی

خدمت' کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے ایک چونکہ ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے اور یہ پروفیسر محمد مجیب کی جامعہ کے نام سے بھی مشہور تھی، لہٰذا مرزا فرید الحسن بیگ کو اس یونیورسٹی سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور محبت تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ایک ادارہ کے طور پر جامعہ کو جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، مرزا فرید الحسن بیگ اس سے لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے، اور جامعہ کو اس لائق بنا دیا کہ وہ اپنی لڑائی خود لڑ سکے۔

جامعہ کو جب اقلیتی درجہ دلانے کا وقت آیا، تو مرزا صاحب نے باصلاحیت لوگوں کو ایک ساتھ جمع کر کے، اس کی قانونی لڑائی کو منطقی انجام تک پہنچانے میں بنیادی رول ادا کیا۔

چند سالوں کے بعد جب کیس صحیح جگہ پر پہنچ گیا اور اس کی سماعت این سی ایم اے آئی کے جسٹس ایم ایس اے صدیقی کے سامنے ہوئی، تو مرزا صاحب نے جج سے رابطہ کیا اور انھیں اپنی تشویش بتائی کہ وہ اس معاملے میں انصاف چاہتے ہیں۔ انھوں نے جج سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ کسی کے دباؤ میں نہ آئیں، کیوں کہ یہ معاملہ اُن لاتعداد طالب علموں کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے، جو اسے اقلیتی ادارہ کا درجہ حاصل ہونے کے بعد جامعہ میں اپنی استعداد کے مطابق تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

مرزا فرید الحسن بیگ نے غصے میں کہا، ''دیکھئے جج صاحب، میں چاہتا ہوں کہ جامعہ کے ساتھ انصاف ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا، تو میں آپ کے بنگلہ کے سامنے اپنے جسم پر مٹی کا تیل ڈال کر خود کو آگ لگا لوں گا۔ اور آپ یہ نہ سوچیں کہ میں ہوا میں باتیں کر رہا ہوں۔ میں پوری میڈیا کو بلاؤں گا اور لوگوں کی بھیڑ کے سامنے خود کو آگ لگاؤں گا۔''

ایڈووکیٹ طارق صدیقی کے مطابق، یہ انتہائی سخت کیس تھا، کیوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) سے متعلق عزیز باشا کا ایک ایسا ہی کیس عدالت میں زیر التوا تھا اور حکومت کا مؤقف یہ تھا کہ اے ایم یو اقلیتی ادارہ نہیں ہے۔

ایڈووکیٹ طارق صدیقی نے بتایا کہ ''ہم نے گہرائی سے پورے کیس کا مطالعہ کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے تین عرضیاں داخل کیں۔ ہم نے اپنے کیس کو جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، اچھے

انداز سے رکھا اور آخر کار چھ سالوں کی لڑائی کے بعد، جامعہ کو اقلیتی ادارہ ہونے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔''

اقلیتی ادارہ کا درجہ ملنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایڈووکیٹ طارق صدیقی کے مطابق، ''جب ایک رکشہ چلانے والے کو یہ معلوم ہوا کہ جسٹس ایم ایس اے صدیقی نے جامعہ کو اقلیتی ادارہ قرار دے دیا ہے، تو اس نے فرطِ خوشی میں دس روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکالا اور بولا، 'میں بھی خوشی کی اس تقریب میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور اس موقع پر مٹھائی خریدنے کے لیے اپنی طرف سے دس روپے دیتا ہوں۔''

ایڈووکیٹ طارق صدیقی نے مزید بتایا کہ ''مرزا فرید الحسن بیگ بہت اچھے انسان تھے۔ بغیر کسی بھید بھاؤ کے، ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے۔ وہ کوآپریٹو موومنٹ میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے مخالفت حالات کا سامنا ڈٹ کر کیا اور تمام ممبران کو ایک ساتھ ملا کر رکھا۔''

ہریانہ کیڈر کے سابق آئی اے ایس افسر، جے ایس سانگوان نے مرزا صاحب کے تئیں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔ کالج کے دنوں میں میری ملاقات ایک دن مرزا فرید الحسن بیگ سے ہوئی۔ ان سے ملاقات کرنے سے پہلے میں اپنے والد کو اپنا آئیڈیل مانتا تھا، لیکن مرزا صاحب سے ملنے کے بعد ان کے کردار اور کشادہ دلی کو دیکھ کر اب میں ان کا معتقد ہو گیا۔ میرے والد بھی زندگی بھر مخالف حالات سے لڑتے رہے، ایسا ہی مرزا صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں ہی سماج کے لیے اور آنے والی نسلوں، خاص کر غریبوں اور کمزور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر بہت کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔''

جے ایس سانگوان نے مزید بتایا کہ ''اپنی طالب علمی کے زمانے میں، مجھے جامعہ میں مختلف بیک گراؤنڈ کے لوگوں سے قریب سے ملنے کا موقع ملا۔ جامعہ کیمپس میں مجھے ذات پات، فرقہ واریت یا انتہا پسندی کا شائبہ تک دیکھنے کو نہیں ملا۔ یہاں پر سبھی ایک ہی نظریہ (آئیڈیالوجی) کو مانتے ہیں، اور وہ ہے ہندوستانیت۔ یہ کیمپس ہندوستان کو، اس کی بنیادی روح کے طور پر پیش کرتا ہے۔''

چودھری رگھوناتھ سنگھ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں طالب علمی کے دوران اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''حکومت ہند نے وزارتِ تعلیم کے توسط سے، پورے ہندوستان میں 10 دیہی ترقیاتی ادارے کھولے۔ انھیں اداروں میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی تھا، جہاں میں دیہی ترقیاتی کورس کے پہلے بیچ کا اسٹوڈنٹ تھا۔''

چودھری رگھوناتھ سنگھ نے مزید بتایا کہ ''آزادی کے بعد گاندھی جی نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کہا کہ ہمیں لوگوں کو ایسی تعلیم دینی چاہیے، جو زمینی سطح پر ان کے لیے فائدہ مند ہو۔ چونکہ ہندوستان کے 80 فیصد سے زیادہ لوگ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں، اس لیے صرف بیچلر آف آرٹس (بی اے) یا ماسٹرس (ایم اے) کی تعلیم ہی کافی نہیں ہے۔ تعلیم سے صرف روزگار ہی نہیں ملنا چاہیے، بلکہ اس سے دیہی ہندوستان کی ترقی بھی ہونی چاہیے۔ دیہی اداروں کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس کورس میں عالمی آئین، سماجیات، تاریخ، جغرافیہ، ہندی، انگریزی اور اردو زبانوں کو شامل کیا گیا تھا، تاکہ ہندوستان کے حقیقی مسائل کو سمجھا جا سکے۔''

مولانا آزاد انٹر کالج، انجان شہید، اعظم گڑھ میں یومِ تاسیس

قوم کی فکر

اپنی زندگی کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد، مرزا فرید الحسن بیگ نے قوم کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور اس عقیدہ کا اظہار کیا، جس نے ایک بہتر انسان بننے میں ان کی رہنمائی کی۔

جسٹس ایم ایس اے صدیقی کے مطابق، مرزا صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے جامعہ کو آپریٹو بینک کے ذریعہ لوگوں کو بااختیار بنانے کا کام کیا۔ جسٹس صدیقی کہتے ہیں، ''جامعہ کوآپریٹو بینک کی شکل میں انھوں نے جس مائکرو فائننسنگ کی شروعات کی، وہ کمزور طبقوں کو بااختیار بنانے کا بہترین طریقہ تھا۔ میں ان کی دوراندیشی اور ایڈمنسٹریشن کو سلام کرتا ہوں، جہاں انھوں نے عملی طور پر یہ کر کے دکھا دیا کہ کسی ادارہ کو کامیابی کے ساتھ کیسے چلایا جاتا ہے۔''

جسٹس صدیقی نے مزید بتایا کہ ''آزادی حاصل کیے ہوئے ہم کو 60 سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں انفرادی کام تو بہت سارے ہوئے ہیں، لیکن قوم کے لیے کوئی بھی مشترکہ یا حقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ مرزا صاحب نے اتنی کم مدت میں جو کام کر کے دکھا دیا، وہ واقعی قابل تعریف ہے۔

خود اپنے قصبہ انجان شہید میں، انھوں نے تعلیم کے ذریعہ لوگوں کو با اختیار بنانے کا کام شروع کیا اور یہاں دہلی میں انھوں نے جامعہ کوآپریٹو بینک کی شکل میں مالیاتی ادارہ کی بنیاد ڈالی، تاکہ لاتعداد کمزور طبقوں کو تعلیم حاصل کرنے، اپنی بیٹیوں کی شادی کرنے، ٹرانسپورٹ کا بزنس شروع کرنے، گھر بنانے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے چھوٹے درجے کا کاروبار شروع کرنے میں ان کی مدد کی جا سکے۔ میں ان کی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے چند اشعار کہنا چاہتا ہوں:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
جب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے
وہ خاموشی ہے کہ سب ہو گئے ہیں پتھر کے
یقین نہ ہو تو کسی کو پکار کر دیکھ

''ایک بار مجھے ان کے آبائی وطن انجان شہید جانے کا موقع ملا۔ میں اسکول کے ایک پروگرام میں شرکت کر رہا تھا، جہاں میں نے ان کے بارے میں ایک شعر سنایا:

کسی کو ہو نہ سکا اُس کے قد کا اندازہ
وہ آسمان ہے مگر سر جھکائے رہتا ہے

''میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ہر صدی میں ہماری قوم کو مرزا فرید الحسن بیگ جیسا شخص ملے، جنھوں نے غریبوں کو خوشحال بنانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور قوم کی بے لوث خدمت کی۔''

نئی دنیا کے ایڈیٹر، شاہد صدیقی کا کہنا ہے، ''میں نے ان کو اپنی قوم کے لیے گہری فکر میں غرق پایا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے تنگ دائرے سے باہر نکلیں اور بہتر مستقبل کے لیے تعلیم حاصل کریں۔ وہ میری اس بات سے اتفاق رکھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل اس ملک کے مستقبل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ چاہے ان کی اقتصادیات کا معاملہ ہو یا پھر کسی اور شعبے کی بات، ان کے طریق کار یا اپیروچ میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہے۔ انھیں دوسری قوموں کے ساتھ تال میل بڑھانی ہوگی۔ انھیں یہ بات سمجھنی پڑے گی کہ دوسری قوموں کے لوگ ان کے دشمن نہیں ہیں۔ لیکن، اگر وہ ان کے بارے میں ایسا سوچتے بھی ہیں، تو پھر انھیں تعلیم اور مقابلہ

آرائی کے ذریعے شکست دینی ہوگی۔''

شاہد صدیقی نے مزید کہا کہ ''مرزا صاحب کی جس بات نے مجھے متاثر کیا، وہ غریبوں، اور خاص کر غریب مسلمانوں کو اونچا اٹھانے کو لے کر ان کی فکرمندی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ کیسے ان کے لیے گھر، اقتصادیات، تعلیم اور سماجی اصلاح سے متعلق پلیٹ فارم اور فورم تیار کیے جائیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ، انھوں نے کبھی اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کوئی ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے کبھی حکومت سے رابطہ کیا۔

''مرزا صاحب بنیادی طور پر ایک سیکولر انسان تھے، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے ان کی فکرمندی بے مثال تھی۔ میرے لیے، وہ صحیح معنوں میں ایک کسان تھے۔ وہ چین سے واپس آنے کے بعد ایک ورلڈ کلاس ہسپتال بنانا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اب وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے، تب بھی ایک سچے کسان کے طور پر، وہ اس کا ایک بیج بونا چاہتے تھے، تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہوسکیں۔ لوگ عام طور پر اِمپاورمنٹ کی باتیں کرتے ہیں، لیکن میرا اور مرزا صاحب کا یہی ماننا تھا کہ کسی کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دینا ہی اصلی اِمپاورمنٹ ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے، جو ہمیں اقتصادی خوشحالی کی جانب لے جاتی ہے۔ میں لفظ 'مقابلہ آرائی' کو ترجیح دیتا ہوں، جو کہ آج کے تناظر میں مسلمانوں کے لیے کافی اہم ہے۔ انھیں مزید مقابلہ آرا ہونا پڑے گا، کیا ہے اور آئندہ کیا ہوگا، اس کے بارے میں انھیں مزید بیدار ہونا پڑے گا۔ یہ خوبی میں نے مرزا صاحب کے اندر دیکھی، جن کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہا کرتی تھی۔ وہ مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں دوسروں کے مقابلے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ مسلم کمیونٹی کے درد کو اگر ہم محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں ان کو اس درد سے نجات دلانی ہوگی اور اس کا طریقہ تعلیم اور ان کے اندر مقابلہ آرائی پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دن مرزا صاحب نے میرے سامنے پوری دنیا کے مسلمانوں کے بارے میں اپنی فکر کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ مسلمانوں کے لیے بین الاقوامی سطح پر سخت ترین دور چل رہا ہے۔ عرب دنیا کے لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے خلاف سازش کر رہے ہیں، حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی

بجائے وہ خود اپنی غلطیوں کو سدھاریں۔ گزشتہ سو سالوں کے درمیان عربوں پر تسلط قائم کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں، جس کا اثر انھیں اب دیکھنے کو مل رہا ہے۔ تیل کی دولت نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انھیں سب کچھ حاصل ہو چکا ہے۔

''میرا اخبار، نئی دنیا مسلمانوں کی اصلاح، ان کے سوچنے کے طریقے کو بدلنے اور انھیں صحیح صورتِ حال سے واقف کرانے کے لیے وقف ہے۔ اگر آپ نے خود کو ان کے لیے وقف کر دیا ہے، تو آپ کو انہی کی زبان میں ان سے بات کرنی ہوگی۔ اسی لیے میں نے اردو میں کام کرنے کا فیصلہ کیا، حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے انگریزی میں بھی کام کر سکتا تھا۔ مرزا فرید الحسن بیگ اور (حکیم) عبدالحمید جیسی دو عظیم شخصیات نے بھی یہی کیا۔ یہ دونوں اپنے ملک سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور انھوں نے اس سرزمین کو اپنا میدانِ عمل بنانے کا فیصلہ کیا۔ مرزا صاحب نے جہاں جامعہ کے لوگوں کے لیے کام کرنے کا فیصلہ کیا اور ذاکر باغ، جامعہ کو آپریٹو بینک بنائے، وہیں عبدالحمید صاحب نے جامعہ ہمدرد قائم کیا۔ میں ان کے وژن اور کام کی تعریف کرتا ہوں، کیوں کہ ان لوگوں کے پاس جتنا پیسہ تھا، اگر وہ چاہتے تو آسانی سے ہندوستان کے باہر جا سکتے تھے، اپنے بچوں کو کسی اور ملک میں بسا سکتے تھے اور زندگی کا لطف اٹھا سکتے تھے، لیکن دونوں نے خود کو اپنی جڑوں سے ہی باندھے رکھنے کا فیصلہ کیا اور یہاں اپنی قوم کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی بھی خدمت کرتے رہے۔''

انجینئر احمد سعید نے اپنی قوم اور کمزوروں کے تئیں مرزا صاحب کی فکرمندی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''میں سوشل ورک کو لے کر بیگ صاحب کی سنجیدگی سے کافی متاثر تھا۔ میں نے کئی موقعوں پر اُن کے ساتھ مل کر کئی ایسے مسائل حل کیے، جن کے بارے میں ہمیں لگتا تھا کہ اس سے ضرورت مندوں کو راحت ملے گی۔ ہم نے اپنے علاقے میں طبی خدمات مہیا کرانے کے لیے حکومت سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا۔ حکومت تیار ہوگئی، لیکن ڈسپینسری بنانے کے لیے کئی جگہ موجود نہیں تھی۔ ہم نے تب رسول خان نام کے ایک صاحب سے ملاقات کی، جو کہ ایئر فورس سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھوں نے خوشی خوشی اپنے گھر کو ڈسپینسری خدمات کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ڈسپینسری جب کام کرنے لگی، تو مرزا صاحب یہ دیکھ کر کافی خوش ہوئے کہ غریبوں کو طبی سہولیات ملنے لگی ہیں۔''

آئی اے ایس اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، محمود الرحمٰن کے مطابق، مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مرزا صاحب ہمیشہ فکرمند رہے اور ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہے کہ تعلیمی ادارے کیسے قائم کیے جائیں، جن سے انھیں طویل مدت تک فائدہ ملتا رہے۔ محمود الرحمٰن بتاتے ہیں، ''مرزا فرید الحسن بیگ ایک یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے، جس کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا تھا۔ بدقسمتی سے انھیں اس خواب کو پورا کرنے کا وقت نہیں مل پایا۔''

محمود الرحمٰن مزید بتاتے ہیں کہ ''آئی آئی سی اور وائی ایم سی اے کی طرز پر ہمیں ایسے بین الاقوامی مراکز کی ضرورت ہے، جہاں مسلم نوجوان ایک بھرپور دانشورانہ ماحول میں آزادی کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ ان مراکز میں ہمارے نوجوانوں کو قیام کرنے، سوشل ٹرینڈس پر مباحثہ کرنے، تعلیمی ورکشاپ منعقد کرنے اور بین مذہبی مذاکرات کے لیے عالمی معیار کی سہولیات مہیا ہونی چاہئیں۔ اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مرزا صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، 'دل کرتا ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں آگے آئیں، بات چیت کریں، جدید دانشورانہ ماحول کی سہولیات حاصل کریں اور سستی قیمتوں پر قیام کریں، جہاں انھیں خود آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے اور وہ دوسروں کو بھی اس کے لیے آمادہ کر سکیں۔''

محمود الرحمٰن نے مزید کہا کہ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بہت سے درخشاں ستارے پیدا کیے ہیں، لیکن ایسے کئی اور اداروں کی ضرورت ہے، جہاں سے ایسے ماہرین پیدا کیے جا سکیں۔ اور اگر ہم مرزا صاحب کے ذریعے عطا کردہ اُس وژن اور رہنمائی سے سبق حاصل کریں، تو یہ مشکل بھی نہیں ہے کہ جب بھی کوئی شروعات کی جائے، تو وہ پوری طرح ایمانداری اور سنجیدگی پر مبنی ہو۔ ہمیں ان اداروں کے ذریعہ اپنے مسلم نوجوانوں میں یہی کردار اور خوبی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔''

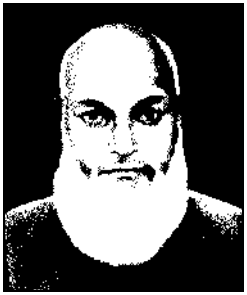

مرحوم مرزا رضا بیگ

رضا زکوۃ فاؤنڈیشن

بیگ فیملی کے تمام رشتہ داروں اور قریبی دوستوں سے جمع کی گئی زکوۃ کی رقم کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے کے لیے ایک نئی شروعات کی گئی، تاکہ اس کے مقصد کو پورا کیا جا سکے۔ گھر کے سبھی افراد کو اس کی اطلاع دی گئی اور باہمی صلاح ومشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس رقم سے اُن غریب، حقدار اور ضرورت مند طلبہ کی مدد کی جائے، جنھیں مالی پریشانیوں کے سبب اپنی پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑنی پڑی۔

اور، اسے 'تیل ڈالی ہوئی مشین' کی طرح چلانے کے لیے سال 2009 میں رضا زکوۃ فاؤنڈیشن کا رجسٹریشن کرایا گیا۔ فاؤنڈیشن مرزا فرید الحسن بیگ کی بہوؤں میں سے ایک، صدف بیگ کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ایک بڑے مقصد کے لیے تیار کرنے میں مرزا صاحب نے ان کی زندگی میں کیا رول انجام دیا، اسے یاد کرتے ہوئے صدف بتاتی ہیں، ''یہ ہمارے سرپرست مرحوم مرزا صاحب کے خیالات وجذبات کے احترام میں شروع کی گئی ایک پہل ہے، جنھوں نے غریب طلبہ کی ہمیشہ مدد کی۔

وہ بچوں کو تعلیم کے ذریعہ بااختیار بنانا چاہتے تھے۔ان کی بہو ہونے کے علاوہ بھی، میں ان کے ساتھ کئی طرح سے جڑی ہوئی تھی۔انھوں نے مجھے زندگی سے پیار کرنا اور اسے بامعنی مقصد کے تحت گزارنا سکھایا۔رضا زکوۃ فاؤنڈیشن کے تحت ہم ان طلبہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں، جو باصلاحیت ہیں،لیکن پیسے کی کمی کے سبب اپنی پڑھائی کو جاری نہیں رکھ سکتے۔''

رضا زکوۃ فاؤنڈیشن کے خزانچی، ایاز مبین بتاتے ہیں،''آر زیڈ ایف 2009 میں رجسٹر ہوا اور شروع شروع میں اس نے تقریباً 4 لاکھ روپے جمع کیے۔آج اس فاؤنڈیشن کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی ہے کہ اس سے متعدد شعبے میں تعلیم حاصل کر رہے طلبہ کی کفالت کی جا رہی ہے۔یہ بچے انجینئرنگ، میڈیکل،لٹیریچر،ایکانومکس اور لینگویج وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔اس رقم کا 75 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے، جب کہ بقیہ پیسے سے سماج کے بے سہارا اور اقتصادی طور پر خستہ حال افراد کی فوری (ایمرجنسی) ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔''

ایک ایسے ملک میں، جہاں آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور تعلیم کے تئیں لوگ بیدار ہو رہے ہیں، ایسے طلبہ کی ایک لمبی فہرست ہے، جنھیں اپنی پڑھائی کو جاری رکھنے کے لیے مالی مدد کی ضرورت ہے۔اتنی بڑی تعداد میں سے فاؤنڈیشن حقدار بچوں کا انتخاب کیسے کرتا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رضا زکوۃ فاؤنڈیشن کی سکریٹری، صدف ظفر بیگ کہتی ہیں،''ہم درخواست گزار کے ایجوکیشنل ٹریک ریکارڈ کو اچھی طرح چیک کرتے ہیں اور یہ بھی دھیان میں رکھتے ہیں کہ اس کی سفارش کس نے کی ہے۔اس کے علاوہ ہم خود بھی اس سے مل کر بات چیت کرتے ہیں، تاکہ یہ پتہ لگا سکیں کہ واقعی میں وہ اس کا حقدار ہے، اور مطمئن ہونے کے بعد ہم اس کے پورے کورس کا خرچ برداشت کرتے ہیں، چاہے وہ قلیل مدتی (شارٹ ٹرم) کورس ہو یا طویل مدتی۔اگر ہمیں پتہ چلا کہ وہ شخص حقدار تو ہے،لیکن پیسے کی کمی کے سبب وہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا رسکتی، جب کہ اس کے اندر صلاحیت موجود ہے،تو ہم اسے اس یقین دہانی کے ساتھ ایک موقع دیتے ہیں کہ وہ محنت سے پڑھائی کرے اور کم از کم 80 فیصد نمبرات کے ساتھ امتحان پاس کرے۔''

مرزا احسان اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج، انجمن شہید، اعظم گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے مرزا فرید الحسن بیگ

اردو زبان سے لگاؤ

مرزا صاحب اردو شاعری کے مداح اور اردو شاعر کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ ہندوستانی معاشرے میں شاعر کے وقار کو ہمیشہ بحال کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں اردو زبان کے زوال کے سبب ایک عام آدمی کے مقابلے شاعر کا احترام گھٹتا جا رہا تھا۔

مرزا صاحب اردو زبان کو اس لیے اتنا پسند کرتے تھے، کیوں کہ یہی وہ زبان تھی، جو انھوں نے اپنی ماں سے سیکھی، اسی زبان میں ان کے ذہن کو جلا ملی، اسی زبان میں وہ سوچا کرتے تھے، اور اسی زبان کے علمی اور ادبی خزینہ سے انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق فیض حاصل کیے۔

وہ جذبہ کیا تھا، جس نے مرزا صاحب کی زندگی کو متاثر کیا؟ کثرت میں وحدت کی تلاش، تباہی میں تعمیر کی خواہش اور ایک مشترکہ ثقافت اس کا جواب ہے۔ ہندوستان میں اپنی ثقافت کے اظہار کی جتنی بھی شکلیں ہیں، ان میں اتحاد کی روح اپنی حقیقی اور واضح شکل میں جس زبان میں پیش کی گئی ہے، وہ صرف اردو ہے۔ اسی لیے مرزا صاحب اردو زبان کی فطری خوبصورتی سے اتنے متاثر تھے۔

اردو کے معروف شاعر اقبال اشہر، جن کی مرزا صاحب کافی تعریف کرتے تھے، بتاتے ہیں کہ ''مرزا صاحب اردو سے اس قدر پیار کرتے تھے کہ جب بھی انھیں یہ معلوم ہوتا کہ اردو سے جڑا ہوا کوئی شخص کسی پریشانی میں مبتلا ہے، تو وہ فوراً اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتے، تاکہ اس نے اس زبان کی خدمت کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے، وہ نہ رکے۔ میرے معاملے میں بھی، انھوں نے یہی کہا کہ میں اردو کی خدمت کرنا جاری رکھوں اور مسائل سے نمٹنے کی ذمہ داری ان پر چھوڑ دوں۔''

مرزا صاحب کے پوتوں میں سے ایک، مرزا ثاقب بیگ اپنے دادا کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''اردو شاعری سے ان کے دل کو بڑی راحت ملتی تھی۔ اگر کوئی غزل سناتا، اشعار گنگناتا یا اردو کے جملے استعمال کرتا، تو وہ اسے سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ مرزا صاحب کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے چچا سے درخواست کی کہ وہ مجھے چند اشعار لکھ کر بھیج دیں، تاکہ میں انھیں سنا سکوں، جسے سن کر وہ نہ صرف خوش ہوتے، بلکہ میری تعریف بھی کرتے۔''

مرزا محفوظ بیگ اور بیگ فیملی کے دیگر اراکین جیش پبلک اسکول، انجان شہید، اعظم گڑھ میں یومِ آزادی مناتے ہوئے

یادرہی گاؤں کی مٹی

بیگ صاحب جن دنوں جامعہ نگر علاقے میں غریبوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف تھے، انھیں دنوں اتر پردیش کے اعظم گڑھ میں واقع اپنے آبائی قصبہ انجان شہید میں بھی انھوں نے کئی تعلیمی پروجیکٹ شروع کیے۔

مرزا احسان اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج کے بانی مرزا فرید الحسن بیگ، مرزا محفوظ بیگ، مرزا عارف بیگ اور مرزا قمر الحسن بیگ ہیں، جنھیں اس کام میں فیملی کے دیگر اراکین سے بھی تعاون حاصل ہوا۔ کالج کا سنگ بنیاد ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد مرحوم نے 18 فروری، 2003 کو رکھا۔ اس تقریب میں جن دوسرے لوگوں نے شرکت کی، ان کے نام ہیں ابو عاصم اعظمی، رکن پارلیمنٹ؛ اختر الواسع، قومی کمشنر، ہندوستان کی لسانیاتی اقلیتیں؛ منور حاذق، لیزن منیجر، ایمریٹس ایئر لائنس اور نئی دنیا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی کی طرف سے اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ کے شفیق الحسن۔

چند سالوں کے بعد، مرزا محفوظ بیگ پر مرزا فرید الحسن بیگ کے ذریعہ زور ڈالنے پر، بی ایڈ کا نیا کورس شروع کیا گیا، تاکہ اعظم گڑھ علاقے کے طلبہ کو ٹیچنگ پروفیشن کے مواقع کا فائدہ اٹھانے لائق بنایا جاسکے۔ کچھ دنوں بعد مرزا عارف بیگ کے صاحبزادے، مرزا عرفات بیگ نے چند قدم اور آگے بڑھتے ہوئے اس میں بیسک ٹیچنگ سرٹیفکیٹ (بی ٹی سی) اور اسپیشلائزڈ اور پیشہ ورانہ کورسز کی شروعات کی، خاص کر لڑکیوں کو مالی طور پر بااختیار بنانے کے لیے۔

مرزا محفوظ بیگ بتاتے ہیں، ''میرے بھائی مرزا فرید الحسن بیگ اپنی جڑوں سے اتنی محبت اور ان کی اتنی فکر کرتے تھے کہ بھلے ہی وہ دہلی میں رہتے ہوں، لیکن ان کا دل ہمیشہ اعظم گڑھ کے لوگوں کے لیے دھڑکتا تھا۔ دہلی سے جب بھی وہ اپنے وطن آتے، تو اعظم گڑھ علاقے میں داخل ہوتے ہی اپنی تمام فکرمندیوں کو بھول جاتے تھے اور خوشی سے ان کا چہرہ چمکنے لگتا تھا۔ اور، میں جذباتی طور پر ان سے اتنا جڑا ہوا تھا کہ ان کی خواہش میرے لیے حکم بن گئی۔ ان کا خواب تھا کہ اعظم گڑھ میں ایک اعلیٰ معیاری انگلش میڈیم اسکول کھولا جائے۔ میں نے ان کے اس خواب کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور حیش پبلک اسکول کی بنیاد ڈالی، جو اِس وقت محترمہ انیما سکسینہ کی پرنسپل شپ میں خوب ترقی کر رہا ہے۔ جے پی ایس کا سنگ بنیاد سید بلال تھانوی نے 7 مئی، 2014 کو مرزا فرید الحسن بیگ، مرزا محفوظ بیگ، مرزا عارف بیگ، مرزا قمر الحسن بیگ، کنور اجے کمار سنگھ، مرزا یاسر بیگ اور بیگ فیملی کے دیگر اہم اراکین کی موجودگی میں ڈالا۔ اس کے بعد، 10 جنوری، 2015 کو طلبہ کے پہلے بیچ کو اتر پردیش کے وزیر تعلیم، وسیم اور مرزا فرید الحسن بیگ کی موجودگی میں ایڈمیشن فارم تقسیم کیے گئے۔ اپنے وطن اعظم گڑھ کا مرزا صاحب کا یہ آخری دورہ تھا، جہاں انھوں نے مرزا احسان اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج کی طالبہ کے ساتھ، ان کی خودمختاری کی نشانی کے طور پر اپنا یومِ پیدائش (10 جنوری) منایا۔''

اسی دوران انھیں ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جہاں اعظم گڑھ کے لوگ اپنے مسائل اور خدشات پر بات کر سکیں، پھر ان کی یہ باتیں وہاں سے انتظامیہ تک پہنچائی جائیں، تاکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کا کوئی حل نکال سکیں اور اعظم گڑھ کے عوام سرکاری سہولیات کا فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کا نتیجہ ہمیں 'وائس آف اعظم گڑھ' کے نام سے ایک کمیونٹی ریڈیو کی شکل میں دیکھنے کو ملا۔ وائس آف اعظم گڑھ کی پروگرام ہیڈ، سیما شریواستو کے مطابق ''ہم ایسے پروگرام چلاتے ہیں، جن سے متاثر ہو کر لوگ اپنی زندگی میں کچھ بڑا کر سکیں۔ سرکاری افسروں کو اس علاقہ کے لوگوں سے جوڑتے ہیں، تاکہ وہ فلاحی اسکیموں کے بارے میں انھیں بتا سکیں۔ غریبوں کو ایک کھلا پلیٹ فارم عطا کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنے مسائل وخدشات کو ظاہر کر سکیں، یہاں سے اپنی آواز بلند کر سکیں۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے بھتیجے، مرزا عارف بیگ کے مطابق، مرزا صاحب صرف ایک انوکھے سوشل ورکر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک مینجمنٹ گرو بھی تھے۔ ''میرے والد صاحب کا انتقال 68 سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ وہ میرے ہیرو اور بڑے دور اندیش تھے، جو تعلیم کے ذریعہ انقلاب لانا چاہتے تھے۔ میرے چچا مرزا فرید الحسن بیگ میرے والد سے 18 سال چھوٹے تھے۔ ان سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ میرے والد کی طرح انھوں نے تعلیم کے ذریعہ لوگوں کی خدمت کرنے میں مہارت حاصل کی۔ اسکول اسٹاف کی تقرری کے وقت انھوں نے مجھے لاکھ ٹکے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ عہدوں، خاص کر پرنسپل یا صدرِ شعبہ کی تقرری 5 سال سے زیادہ مدت کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ان کی کارکردگی بہتر ہو، تو ان کی میعاد کو آگے بڑھا دیں۔ اس مشورہ پر جب میں نے عمل کیا، تو اسے ایک انقلابی مشورہ پایا۔ لوگوں سے جب تعلقات بنانے یا صفائی کی بات آتی، تو اس میں وہ حد درجہ فعالیت دکھاتے۔ وہ فائلوں کو اٹھاتے، ان پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرتے اور ایسا کرتے وقت اپنی حیثیت یا مقام کا بالکل خیال نہ کرتے۔ مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں آتا، جب کوئی ضرورت مند ان کے پاس آیا ہو اور انھوں نے اس کی مدد کرنے سے منع کر دیا ہو۔ بعض دفعہ تو اس حد تک آگے بڑھ جاتے کہ دوسروں کی مدد کرنے کے لیے اپنے ذاتی استعمال کی چیزوں کو فروخت کر دیتے اور کئی بار دوسروں سے پیسہ قرض مانگ لیتے۔ ایسے لوگ دنیا میں مشکل سے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک بڑا خلاء چھوڑا ہے، لیکن ان کی باتیں ان کی غیر موجودگی میں بھی ہم سبھی لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔''

ایک عام آدمی کے برعکس، مرزا صاحب ہمیشہ اپنی جڑوں کی آبیاری کرنے کے قائل رہے۔ 'اعظم گڑھ' لفظ سنتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ ہمیشہ اسی تگ ودو میں لگے رہے کہ کیسے اعظم

گڑھ کی سرزمین اور ساتھ ہی وہاں کے باشندوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے جائیں۔

سینئر سیاسی کارکن اور سوشل ورکر، اتل کمار انجان نے بتایا کہ ''انھوں نے اعظم گڑھ میں غریبی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی جانبداری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک بچہ کے طور پر ان کے نازک ذہن پر ان تمام حالات کا بہت برا اثر پڑا۔ چونکہ مرزا صاحب ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور برطانوی دورِ حکومت میں اس خاندان کا سماج میں ایک بڑا رتبہ تھا، لہٰذا اعظم گڑھ کے لوگوں پر انھوں نے اچھی پکڑ بنائی۔ اور صرف مرزا فرید الحسن بیگ ہی نہیں، بلکہ ان کی پوری فیملی بشمول ان کے والد، چچا اور دیگر اہم اراکین، سبھی غریبوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ گاؤں والے ان کے پاس اپنی پریشانیاں لے کر آتے اور بیگ فیملی پیسے سے، کھانے سے یا جو کچھ بھی ان کے پاس موجود ہوتا، اس سے ان کی مدد کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ بیگ فیملی کے اراکین کو سبھی نیک انسان تصور کرتے تھے۔''

جیش پبلک اسکول، اعظم گڑھ کے ڈائرکٹر، مرزا یاسر بیگ کے مطابق، مرزا صاحب نے عملی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا، جو آدمی کو نوکری دلا کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر سکتی ہو۔ بقول مرزا یاسر بیگ، ''وہ جب بھی مجھ سے ملتے، جیش پبلک اسکول کے بارے میں ضرور دریافت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے جیش پبلک اسکول کے نصاب کے بارے میں ان کو بتایا تھا۔ وہ اسے پڑھنے کے لیے بے چین تھے۔ انھوں نے کئی لوگوں کو یہ نصاب دکھایا، تاکہ ان کی طرف سے بامعنی مشورے مل سکیں۔ وہ معیار کو لے کر اتنے فکرمند رہتے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی باریکیوں پر نظر رکھتے تھے۔''

مرزا یاسر بیگ نے مزید بتایا کہ ''آپ چاہے جو بھی کریں، تعلیم حاصل کریں، نوکری کریں یا پھر کوئی اور چیز، یہ سب اعلیٰ معیار کا ہونا چاہیے۔ جیش کے اسکول اسٹاف کی تقرری کے دوران وہ مجھ سے ہمیشہ معیار (کوالٹی) پر دھیان دینے کے لیے کہتے۔ اس کے علاوہ، عام سماجی پیٹرن کے معاملے میں، وہ ہر چیز قربان کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ جب لوگوں کا کوئی گروپ ایک ساتھ کھانا کھا رہا ہوتا تھا، تو وہ جوٹھی پلیٹیں اٹھا کر کچن میں لے جاتے۔ یہاں بھی، وہ دوسروں کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ذاتی سکون کے لیے اس کام کو انجام دیتے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کے قریبی دوست، نظام الدین اعظمی نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کو اپنی جڑوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ اعظم گڑھ کو خطہ یونان سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرا شعبہ جس کے لیے وہ کافی فکرمند رہا کرتے تھے، وہ لڑکیوں کی تعلیم تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لڑکیوں کو پھول کی کلی کی طرح کچل کر پھینکا نہیں جانا چاہیے، جس کا کوئی مستقبل نہ ہو اور ان کی پوری قوت ابتدائی عمر میں ہی نچوڑ لی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اعظم گڑھ کی ہر لڑکی پورے عزو وقار کے ساتھ زندگی گزارے اور یہ تبھی ممکن تھا، جب وہ صحیح تعلیم حاصل کریں۔ مرزا احسان اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج مرزا صاحب کے اس خواب کو کافی حد تک پورا کر رہا ہے۔''

اتل کمار انجان نے دیکھا کہ مرزا فرید الحسن بیگ میں سماجی خدمت کا جذبہ پورے آب وتاب کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اپنی جڑوں کے لیے، خاص کر لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی خودمختاری کے لیے سب کچھ کرنا چاہتے تھے۔ بقول اتل کمار انجان، ''ایک بار میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ شبلی کالج کے کام کاج میں ہاتھ بٹائیں، کیوں کہ تعلیمی ادارے کو آگے لے جانے کا جذبہ ان کے اندر بے نظیر تھا۔ میں نے سوچا کہ ان کے جیسی شخصیت اس ادارہ کے مسائل کو آسانی سے حل کرا لے گی، کیوں کہ اسے چلانے والا ان سے بہتر میری نظر میں کوئی اور انسان اس وقت موجود نہیں تھا۔ انھوں نے میری بات کو غور سے سنا، لیکن اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ مجھے ذلت محسوس ہوئی، لہٰذا بہت دنوں تک ہم دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور تفصیل سے بتایا کہ کسی ادارہ کو چلانے کا کام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے، جتنا کہ سمجھا یا بتایا جاتا ہے۔ اور وہ اس قسم کی بے سود سرگرمیوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ انھوں نے لاکھ ٹکے کی بات یہ بھی کہی کہ کسی بھی ادارہ کو چلانے کا کام رکنا نہیں چاہیے۔ اُن دنوں شبلی کالج کا ماحول کافی خراب تھا، ایسے میں اگر انھیں بھی کالج میں شامل کر لیا جاتا، تو وہاں کے بہت سے اسٹاف ناراض ہو جاتے، جس سے ماحول اور خراب ہوتا اور طلبہ کا نقصان ہوتا۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

اتل کمار انجان چونکہ اپنے حلقہ انتخاب میں کافی سرگرم ہیں اور اس علاقہ کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے طور طریقے ڈھونڈتے رہتے ہیں، لہٰذا مرزا صاحب نے ایک بار مجھے مشورہ دیا کہ میں

اپنے حلقہ کے لوگوں کے ساتھ صحیح رابطہ قائم کروں۔

اتل کمار انجان بتاتے ہیں،''میں یہی سوچا کرتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہی سب سے بہتر ہے، لیکن مرزا صاحب نے لوگوں کے درد اور مصیبتوں کو سمجھنے کا اس سے بھی بہتر طریقہ مجھے بتایا۔ میں نے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا، ان سے ملنا جلنا اور ان کے مسائل اور پریشانیوں کو سمجھنے کے لیے انھیں کے نظریہ سے زندگی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ رشتوں کو مضبوط بنانے میں میری کافی مدد کی۔ میری نظر میں وہ ایک انسانیت نواز شخص تھے۔ وہ اعلیٰ قدروں کے حامل تھے اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ میں مرزا فرید الحسن بیگ کے وژن اور فہم کو دل کی گہرائیوں سے سلام کرتا ہوں۔''

مرزا صاحب کے ساتھ اپنی متعدد ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں کہ''ایک بار مرزا صاحب نے مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں میری رائے جاننے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے دل کی بات انھیں بتائی، جس کی انھوں نے جم کر تعریف کی۔ 1981 میں، میں نے مئو کے ڈی سی ایس کے پی جی کالج کا دورہ کیا۔ اس زمانے میں اس کالج میں بہت کم مسلم لڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔ آج میں سینکڑوں برقعہ پوش لڑکیوں کو اس کالج میں جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

''ایک دوسرے موقع پر، مرزا صاحب نے لڑکیوں کے لیے ہنرمندی پر مبنی تعلیم کی افادیت پر مجھ سے بات کی۔ انھوں نے اس کا ایک روڈ میپ تیار کیا اور اس پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان لڑکیوں کے لیے اسکل مینجمنٹ کی بات آج کر رہا ہے، جب کہ مرزا صاحب نے اس کے بارے میں نہ صرف بہت پہلے سوچ لیا تھا، بلکہ 10 سال پہلے ہی اسے نافذ بھی کر دیا تھا۔

''بیگ صاحب نے جتنی باتیں کہی تھیں، ان میں سے کچھ ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہیں، لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ فیملی کے لوگ اسے پورا کر کے دکھائیں گے، کیوں کہ وہ نہایت قابل، محنتی، صاف دل، ایماندار اور کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اگر وہ اس پر سنجیدگی سے کام کریں، تو یہ اس شخص کے تئیں سب سے بڑا نذرانہ ہوگا، جو دوبارہ تو کبھی پیدا نہیں ہوگا، لیکن اس کی خوبیاں اور کارنامے تب تک انسانوں کو فائدہ پہنچاتی رہیں گے، جب تک یہ دنیا قائم ہے۔

''چونکہ ہم دونوں ہی اعظم گڑھ اور اس کے گرد و نواح کو لے کر فکر مند رہا کرتے تھے، لہٰذا انھوں نے ایک دن بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں میری رائے جاننی چاہیے۔ ایک سیاسی کارکن، سماجی تبدیلیوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے شخص کے طور پر، جو دنیا کے معاملات کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے، میں نے ان سے کہا کہ دنیا کو اس وقت دو نہایت سنگین مسائل کا سامنا ہے - جارحانہ آمریت، جس کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ میں جنگ ہو رہی ہے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں اس کی وجہ سے بے چینی پیدا ہو رہی ہے، اور دوسرا - لاکھوں لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا، جو کہ انٹرنیشنل فائنشیل کیپٹل کی پالیسیوں کی وجہ سے سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ فوجی طور پر طاقتور ممالک کے ذریعہ ترقی پذیر اور کم ترقی پذیر ممالک کے وسائل پر قبضہ کی وجہ سے قدرتی وسائل کی لوٹ ہو رہی ہے، بدامنی پھیل رہی ہے، ٹکراؤ والے علاقوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس قسم کی مزید برائیاں پھیل رہی ہیں۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ تعلیمی انقلاب کے لیے کام کو جاری رکھیں، کیوں کہ ایک دن ایسا آئے گا، جب برائیوں کو اپنا پیر پھیلانے کی جگہ نہیں ملے گی۔

''ہندوستانی تناظر میں، میں نے ان سے کہا کہ میری سب سے بڑی ترجیح اس وقت یہی ہے کہ ہندوستانی آئین کے سیکولر کردار کو کیسے بچایا جائے۔ اگر مذہبی انتہا پسندی منظّم طریقے سے پھیلتی ہے، تو اس سے انسانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام ہوگا اور ہندوستان پوری طرح تباہ ہو جائے گا۔ اسی لیے قدامت پرستی، چاہے وہ ہندو قدامت پرستی ہو یا اسلامی، کے خلاف لڑنا ہی صحیح طریقہ ہوگا۔ انھوں نے ہنستے ہوئے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی پوری زندگی جس کے لیے کاربند رہے، وہ یہی چیز تھی۔ وہ ہمیشہ مختلف قوموں کو آپس میں مل کر رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں جارحیت یا بنیاد پرستی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اور چونکہ وہ زندگی بھر اسی نظریہ پر قائم رہے، اس لیے وہ لوگوں کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اقتصادی خودمختاری کے ذریعہ ان کے اوپر مواقع کے نئے دروازے کھول کر انھوں نے ان کے اندر اعتماد کا نیا جذبہ پیدا کیا۔ دوسروں کی زندگیوں کو خوشحال بنانے کا ان کے اندر جو بے لوث جذبہ اور حوصلہ تھا، وہ آج کے دور میں ناپید ہو چکا ہے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ اپنی اہلیہ نور جہاں خانم، بیٹیوں، بہوؤں اور پوتے / پوتی کے ہمراہ

گھریلو زندگی

مرزا فرید الحسن بیگ نے ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ہمیشہ رضامندی دکھائی۔ ان سے مدد حاصل کرنے والوں میں ان کے عزیز و اقارب تو تھے ہی، ساتھ ہی اس میں بالکل اجنبی، ان کے سینئرس اور جونیئرس، ان کے دوست اور نوکر سبھی شامل تھے۔ پیسہ اور گھریلو استعمال کی چیزیں دوسروں کے ساتھ شیئر کرنے میں انھیں ایک خاص قسم کی خوشی ملتی تھی۔ ان کی کرم فرمائی کی کوئی حد نہیں تھی، جس سے ان کی فیملی کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کے پاس جب مسلسل اور وافر آمدنی کا ذریعہ موجود تھا، تب بھی ان کی اس کشادہ دلی کی وجہ سے ان کی اہلیہ کو پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ ان کی آمدنی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے ان کی کرم فرمائی کا سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا گیا۔

بیگ صاحب کا طرزِ حیات سادگی، شائستگی اور صفائی سے معمور تھا۔ جن دنوں وہ مالی تنگی کے برے دور سے گزر رہے تھے، تب بھی ان کے جسم پر صاف ستھرے اور شائستہ لباس ہوا کرتے تھے۔ ان کی ظاہری شکل وصورت میں کبھی کسی کو کوئی خامی نظر نہیں آئی، نہ ہی کسی نے ان کے محدود وسائل پر

ہمدردی کا اظہار کیا۔

ان کی بیوی نور جہاں خانم، چار بیٹے مرزا شمس الحسن بیگ، مرزا قمر الحسن بیگ، مرزا اسفر بیگ اور مرزا احمد بیگ، اور دو بیٹیاں نشاط بیگ گپتا اور صبا بیگ خان کے اندر بھی وہی سادگی اور خوش مزاجی دیکھنے کو ملتی ہے، جو مرزا فرید الحسن بیگ کا طرۂ امتیاز تھا۔

ان کی بیوی کی نظر میں دنیا کی زیادہ اہمیت نہیں تھی اور ساتھ ہی وہ ایک سادہ لوح بھی تھیں۔ بیگ صاحب واقعی ایک خوش قسمت انسان تھے، جنھیں اتنی نیک صفات شریک حیات ملیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں کی فطرت اور برتاؤ میں یکسانیت تھی۔ اس کی وجہ سے گھر کا ماحول اتنا اچھا ہو گیا کہ انھیں اپنے سوشل ورک کو انجام دینے، خدا کی عبادت کرنے اور حسن اسلوبی کے ساتھ اپنے ساتھی انسانوں کی خدمت دل و جان سے کرنے کا موقع مل گیا۔ بیگ صاحب اپنی بیوی کی خوبیوں کا اعتراف اکثر کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا کہ ''اگر آپ کی والدہ اتنی سلیقہ مند، اتنی سادہ، اتنی باکمال اور ایک ساتھ اتنی خوبیوں کی مالک نہ ہوتیں، تو آج جو کچھ بھی میں ہوں، وہ نہیں ہوتا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ اہلیہ نور جہاں خانم کے ہمراہ اپنی شادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر

انسانی رشتوں کی اہمیت

مرزا فرید الحسن بیگ کی شخصیت میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا عروج ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے سماجی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق اور والہانہ لگاؤ کو سب سے اوپر رکھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے معاملات میں چھوٹے طبقہ اور بڑے طبقہ کے لوگوں کے درمیان کبھی امتیاز نہیں کیا۔ انھوں نے سماجی خدمت کے جتنے بڑے کام کیے، اتنا ہی ان کے اندر انکساری آتی چلی گئی۔ ان کا مقام جتنا اونچا ہوتا چلا گیا، اتنا ہی وہ اچھائی اور انصاف کے رہنما بنتے چلے گئے، اتنی ہی ان کے اندر پریشان حال اور عام مظلوم انسانوں کے تئیں ہمدردی اور محبت کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ ان کا پیغام صحیح معنوں میں پوری انسانیت کے لیے پیار و محبت کا پیغام بن گیا۔ ان کے اندر یہ خوبیاں روحانی پیشواؤں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوئیں، جس نے انھیں رہنمائی عطا کی اور اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ گرم جوشی کا جذبہ عطا کیا۔

عتیق احمد کہتے ہیں، ''انسانی رشتوں، عاجزی و انکساری اور لوگوں سے ہمدردی کے معاملے میں

وہ میرے رول ماڈل تھے۔ان کو تمام کام بحسن وخوبی کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا۔''

مرزا فیصل بیگ کے مطابق، مرزا فریدالحسن بیگ کے لیے سب سے قیمتی چیز انسانی رشتے تھے۔ کناڈا کے سابق ٹریڈ کمشنر اور یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے ڈائرکٹر کے طور پر اس کے ہندوستان میں واقع دفتر کے موجودہ سربراہ، مرزا فیصل بیگ بتاتے ہیں،''جب میں دہلی آیا، تو یہ مرزا صاحب ہی تھے، جنھوں نے مجھے آگے کا راستہ دکھایا اور ایک ایسے شہر میں میرے گارجین بنے، جو کہ میرے لیے انجان تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی وہ میرے دلدادہ ہو گئے۔ انھوں نے دہلی کے اہم پروگراموں میں جانے کے لیے مجھے بہترین مواقع فراہم کیے۔ وہ پوری فیملی کو ایک ساتھ جمع کر لیتے اور پھر ہمیں سفارت خانوں کی تقریبات میں لے کر جاتے، خاص طور سے لیبیا کے قومی دن کے موقع پر۔ دنیا بھر کی مالی پریشانیوں کے باوجود، وہ اس بات کو ضرور یقینی بناتے تھے کہ ان کے پاس تھوڑا بہت جو بھی ہے، وہ میرے لیے دستیاب ہو۔''

مرزا فیصل بیگ نے مزید بتایا کہ''ایک بار مجھے ایک سانپ نے کاٹ لیا، جس کے بعد مجھے فوراً سٹی ہاسپٹل لے جایا گیا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آئے اور آدھی رات کو میرے والدین کے پاس یہ بتانے خود پہنچ گئے کہ میں ٹھیک ہوں۔ یہ آدمی کی کوالٹی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ کافی حساس تھے اور اندھیری سیاہ رات میں اس کے لیے انھوں نے پیدل دو کلومیٹر کی دوری طے کی۔''

این ایس ایسوسی ایٹس کے ڈائرکٹر، دیویندر راوت ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پڑھائی کر رہا تھا، اس وقت مسلم دوستوں کے ساتھ میری کافی بنتی تھی۔ میں نے اپنے دوستوں سے اسلام، اس کے اصول وقواعد اور دوسرے انسانوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے میں رمضان کے دنوں میں روزے بھی رکھتا تھا۔ مرزا صاحب کو جب اس کے بارے میں پتہ چلا، تو انھوں نے افطار کے پروگرام کا خاص انتظام کیا۔ انھوں نے اس پروگرام میں شرکت کرنے والے تقریباً 400 لوگوں کے سامنے میرے اس فعل پر خوشی کا اظہار کیا۔ مجھے ایک خاص عزت دینے کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا، اس سے میں کافی متاثر ہوا۔''

مرزا صاحب کے قریبی دوست، انجینئر احمد سعید نے بھی اسی طرح کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''ایک بار مرزا فرید الحسن بیگ میرے پاس کچھ مشورہ کرنے کے لیے آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے کچھ پیسے جمع کیے ہیں، جس سے وہ ایک پلاٹ خریدنا چاہتے ہیں۔ اُن دنوں میرے پاس ایک اسکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ہم دونوں اس پر بیٹھے اور ایک علاقے کی طرف نکل پڑے۔ انھوں نے مجھے وہ پلاٹ دکھایا اور پوچھا کہ کیا ہم وہاں پر ایک گھر بنا سکتے ہیں۔ وہاں زمین پر ماچس کا ایک خالی ڈبہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور زمین پر عمارت کا ایک نقشہ بنا کر انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ مرزا صاحب نے بغیر کسی تبدیلی کے، ہو بہو اسی نقشہ کے مطابق وہاں پر عمارت بنوالی ہے، جیسا کہ میں نے انھیں زمین پر بنا کر دکھایا تھا۔''

مرزا صاحب کے بچپن کے دوست، فرقان ہاشمی نے بتایا کہ ''جامعہ سے میں سول انجینئر بن کر نکلا اور میرے پاس ذاکر باغ پروجیکٹ پر کام کرنے کا تجربہ بھی تھا۔ مرزا صاحب نے صرف میرا تعارف اہم شخصیات سے کرایا، باقی میں نے جو کچھ کیا، وہ میری محنت اور قابلیت کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ، میں نے وہاں بہت تھوڑے وقت کے لیے کام کیا، تاہم مجھے کالونی کی تعمیر و ترقی کے بارے میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مرزا صاحب کا بڑا کارنامہ ذاکر باغ کی تعمیر کے لیے رہائشی سوسائٹی قائم کرنا یا جامعہ کو آپریٹو بینک بنانا نہیں تھا، بلکہ اپنی انتھک محنتوں سے ان اداروں کو کامیابی کے ساتھ چلانا ان کی بڑی حصولیابی ہے۔''

مرزا صاحب کے بھتیجے ارشاد بیگ کہتے ہیں کہ ان کی فیملی پر مرزا صاحب کا بڑا احسان و کرم ہے کہ انھوں نے اسے تعلیم یافتہ اور خوشحال بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ارشاد بیگ بتاتے ہیں، ''جب میں پرائمری اسکول میں تھا، تب مرزا فرید الحسن بیگ جامعہ کے طالب علم تھے اور انجان شہید آئے ہوئے تھے۔ ایک دن تانگہ سے ہم کہیں جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک آدمی ایک لڑکے کو بری طرح مار رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آدمی جس لڑکے کو مار رہا تھا، وہ معصوم ہے۔ مرزا صاحب کو یہ ناانصافی برداشت نہیں ہوئی۔ وہ تانگہ سے نیچے کود پڑے اور اس آدمی سے کہا کہ وہ لڑکے کو مارنا بند کرے، لیکن وہ نہیں مانا۔ مرزا صاحب کافی غصے میں آ گئے، انھوں نے تانگہ

والے کے ہاتھ سے چھڑی چھینی اور اس آدمی کو لگے پیٹنے۔ وہ اسے تب تک مارتے رہے، جب تک کہ اس نے لڑکے کو چھوڑ نہیں دیا۔''

ارشاد بیگ نے مزید بتایا کہ ''1974 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، جب میں دہلی آیا، تو مرزا صاحب نے مجھے ذاکر حسین کو آپریٹو سوسائٹی بنانے کی بات کہی۔ میں بھی ممبران کو تیار کرنے اور مسائل سے نمٹنے کے کام میں لگ گیا۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ کردار و اعتبار والے مصلح (ریفارمر) تھے۔ وہ خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں یقین رکھتے تھے، لیکن ساتھ ہی غریبوں کا حق ادا کرنا بھی نہیں بھولتے تھے۔''

ارشاد بیگ کی اہلیہ، سلمیٰ خانم اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں، ''مرزا فرید الحسن بیگ بیش قیمتی نگینہ تھے، جنھوں نے اپنی زندگی غریبوں اور کمزور لوگوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ مرزا صاحب کا کردار اور برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ انھوں نے کسی کے بھی ساتھ اس کے سماجی رتبہ یا مقام کی وجہ سے جانبداری نہیں کی۔ انھوں نے ہمیں سکھایا کہ اگر کوئی مہمان ہمارے یہاں آتا ہے، تو ہمیں اس کی بے عزتی یا بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے، اور ہمارے پاس جو کچھ بھی موجود ہو، وہ اسے پیش کرنا چاہیے، بغیر کسی ہچکچاہٹ یا احساسِ کمتری کے۔''

فرقان ہاشمی، جو اُن کے قریبی گھریلو دوست تھے، مرزا صاحب کے انسانی رشتوں اور انکساری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''ایک بار لوک سبھا انتخابات کے دوران، مشہور سیاسی لیڈر اور انڈین نیشنل کانگریس کے رکن، ارجن سنگھ اپنی ہمشیرہ اور ایک دوست کے ساتھ جامعہ علاقے میں پرچار کے لیے آئے۔ گروپ نے مرزا صاحب کو بھی ساتھ لے جانے کی ضد کی۔ اس وقت میں نوجوان تھا۔ جوش و ولولہ میں، اپنے ہاتھ میں پوسٹر لے کر میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ گرمی بھرا دن تھا۔ وہ جب تین بجے دن میں یہاں آئے، تو مرزا صاحب انھیں اپنے گھر لے گئے۔ وہ خود کچن میں گئے، روٹی اور دال اٹھائی، اور بلا تکلف ہر شخص کو کھانا پیش کیا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی مہمان نوازی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انھیں اس بات کی پروا بالکل نہیں تھی کہ ارجن سنگھ جیسا قد آور لیڈر ان کے بارے میں کیا سوچے گا۔ مرزا صاحب کے پاس جو کچھ بھی تھا، انھوں نے پوری گرم جوشی اور تواضع کے ساتھ مہمانوں کو پیش کیا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ فزیوتھیراپسٹ ڈاکٹر وشالی ککڑ مہتہ کے ساتھ

عورتوں کا احترام اور ان کی خودمختاری

مرزا فرید الحسن بیگ کے اچھے برتاؤ کا ایک خوبصورت پہلو عورتوں کا احترام بھی تھا۔ وہ ان کے وقار اور رتبہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے ساتھ شہزادیوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اور کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے اونچی آواز میں بات کرے یا ان کی بے عزتی کرے۔ خود بیگ صاحب اپنے اعمال و افعال سے اس کی مثال پیش کرتے، یہاں تک کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ ان کی فیملی میں عورتوں کا ایک خصوصی مقام تھا، اور وہ جب تک زندہ رہے، انھوں نے ان کے اس مقام کو برقرار رکھا۔

فیملی کے مردوں کو بعض دفعہ اس سے حسد ہوتا، لیکن بیگ صاحب نے انھیں کبھی بھی عورتوں پر فوقیت نہیں دی، بلکہ دونوں کے رشتوں میں اس طرح کا تال میل بٹھایا کہ پورا ماحول ہمیشہ ہمیش کے لیے خوش گوار ہو گیا۔

مرزا صاحب کی نواسی، سومیا گپتا کے مطابق، ''میرے نانا خواتین کا بہت زیادہ احترام کرتے

تھے۔اسی لیے بیگ فیملی میں یہ روایت بن گئی ہے کہ وہ اپنی بہوؤں کو کچن میں کام نہیں کرنے دیں گے۔اس کے علاوہ بھی ان سے کوئی اور کام نہیں لیا جاتا تھا۔میرے نانا کی نظر میں یہ خواتین کی عزت کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ہماری فیملی میں خواتین کی قدر کی جاتی ہے اور عزت واحترام کے معاملے میں انھیں سب سے اوپر رکھا جاتا ہے، جو کہ واقعی ایک شاندار کارنامہ ہے۔اگر ہم عورتوں کو نہ دبائیں، تو ہمارے معاشرے میں بہت ساری خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔''

سومیا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہتی ہیں،''میرے نانا مجھے ہمیشہ حوصلہ دلاتے تھے کہ میں گاؤں اور ایک اچھی خاتون فنکار کے طور پر چمکتی رہوں۔انھوں نے مجھ پر کئی بار زور ڈالا کہ میں اسٹیج پر پرفارم کروں، جو کہ میں نے کیا بھی۔صرف میری ہی نہیں، بلکہ وہ دوسری لڑکیوں کی بھی اسی طرح حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔وہ اس بات کے زبردست قائل تھے کہ خواتین کو سامنے آنا چاہیے اور اپنی موجودگی کا احساس کرانا چاہیے۔

ڈاکٹر شبستاں غفار کے مطابق، مرزا صاحب خواتین کی تعلیم اور ان کے امپاورمنٹ کے لیے ہمیشہ فکرمند رہے۔ڈاکٹر شبستاں غفار، سابق چیئر پرسن، کمیٹی آن گرلز ایجوکیشن، نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز، حکومت ہند مزید بتاتی ہیں کہ''مرزا صاحب جنسی برابری میں یقین رکھتے تھے۔دراصل، عورتوں کے احترام کو وہ سب سے زیادہ فوقیت دیتے تھے۔خواتین کی عزت کے معاملے میں بیگ فیملی بہترین مثال پیش کرتی ہے، جہاں ہر خاتون رکن کا بے حد احترام کیا جاتا ہے اور انھیں خصوصی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں برسر کار سوشل سائنٹسٹ، ترنم فرقان ہاشمی نے بتایا کہ''پندرہ سال پہلے، شادی کے بعد میں جب ان سے پہلی بار ملی، تو وہ میرے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے، کچن میں گئے اور اپنے ہاتھوں سے میرے لیے چائے بنا کر لے آئے۔انھوں نے اتنے پیار سے مجھے وہ چائے پیش کی کہ میں ان کی اس انکساری اور عزت افزائی سے کافی متاثر ہوئی۔ میں نے ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا، جو تمام عمر خواتین کی اس قدر عزت کرتا رہا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ نے معاشرے کو بہت سی خوبصورت چیزیں عطا کیں۔وہ خود عورتوں کا دل

سے احترام کرتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی انھوں نے یہی چیزیں سکھائیں۔ ترنم فرقان ہاشمی، جن کو پیار سے مرزا صاحب نے ایک بار 'پرینکا گاندھی' کہہ کر پکارا تھا، مزید بتاتی ہیں کہ ''اس فیملی کی انوکھی بات، جس پر وہ فخر کرسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں عورتوں کا مقام سب سے بلند ہے، جو کہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ اپنی اہلیہ نور جہاں خانم کے ہمراہ نوجوانی کے دنوں میں

شریکِ حیات

مرزا فرید الحسن بیگ کو اپنی فیملی سے وابستہ افراد، اپنے نوکروں، بزرگوں، دوستوں اور ہم عصروں کے درمیان ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ وہ سبھی کو عزیز تھے۔ ان کے دوست ان کے رہنما بن گئے، جب کہ فیملی کے اراکین ان پر ناز کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ نور جہاں خانم نے گھریلو ذمہ داریوں سے انھیں آزاد کر دیا تھا۔ وہ اپنا سارا دھیان گھریلو کاموں پر لگاتیں اور اپنے شوہر اور بچوں کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ ایسا بھی وقت آیا، جب بیگ صاحب کی آمدنی کافی محدود ہوگئی۔ اکثر ان کی جیب میں ایک بھی پیسہ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ان کے اندر رحم دلی اور مہمان نوازی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ ان کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔ ان کی بیوی نے مشکل گھڑی میں بھی فیملی کا بھرپور ساتھ دیا اور کسی قسم کے گلہ شکوہ کا کبھی اظہار نہیں کیا۔

''انھیں تنخواہ سے جتنا بھی پیسہ ملتا تھا، لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ میں کافی محتاط ہوکر اس میں سے خرچ کرتی، ساتھ ہی اس میں سے کچھ پیسہ بچا کر بھی رکھ لیتی تھی۔ ان پیسوں سے ناگہانی

حالات سے نمٹنے میں کافی مدد ملتی تھی۔ دراصل، میرے ماں باپ نے جتنے بھی کپڑے مجھے دیے تھے، میں نے ان کا استعمال بہت بعد میں جا کر کیا اور اپنے شوہر سے کبھی بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔'' ان خیالات کا اظہار مرزا فرید الحسن بیگ کی اہلیہ نور جہاں خانم نے کیا، جن کی شادی 1961 میں ہوئی تھی اور جو مرزا صاحب کی جدوجہد بھری طویل زندگی میں، مالی بدحالیوں کے باوجود زندگی گزارتی رہیں اور امید کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور آخر کار وہ دن بھی آیا، جب اللہ کی مدد آئی اور پوری فیملی خوشحال زندگی بسر کرنے لگی۔

اس جدوجہد کی کہانی تفصیل سے بتاتے ہوئے نور جہاں خانم آگے کہتی ہیں، ''میں جب بھی اُن سے ان کے کام کے بارے میں پوچھتی، تو وہ مجھ سے اپنے کاموں کے بارے میں پوچھنے یا اس میں مداخلت کرنے سے منع کر دیتے۔ اس قسم کے برتاؤ سے ہماری شادی شدہ زندگی میں بہت سے مسئلے پیدا ہوئے، لیکن چونکہ میں ایک اچھے اور کھاتے پیتے خاندان سے آئی تھی، اس لیے میں نے سب کچھ سنبھال لیا۔ شادی میں مجھے جو کچھ بھی کپڑے ملے تھے، میں نے ان سب کا استعمال بعد کے دنوں میں کیا اور اپنے شوہر سے کبھی بھی کچھ نہیں مانگا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ اپنی اہلیہ نور جہاں خانم کے ہمراہ دبئی کے سفر کے دوران

صفائی، خوش مزاجی اور اعلیٰ ذہنی

مرزا فرید الحسن بیگ کا لائف اسٹائل سادگی بھرا تھا، جس میں خوش مزاجی اور صفائی دونوں شامل تھی۔ اُن دنوں میں بھی، جب وہ مالی بحران کے دور سے گزر رہے تھے، تب بھی وہ صاف ستھرا اور اچھا لباس زیب تن کیے رہتے۔ انھیں دیکھ کر کوئی بھی ان کی ظاہری شکل وصورت میں کبھی کوئی خامی نہیں ڈھونڈ پایا، نہ ہی کبھی کسی کو ان کی حالت دیکھ کر ترس آیا۔

مرزا ظفر بیگ کی صاحبزادی، الیزہ بیگ اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں کرتی ہیں، ''دادا اپنی ظاہری شکل وصورت کو لے کر کافی حساس تھے اور ہمیشہ جاذب نظر دکھائی دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے چہروں پر جھریاں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے، وہ اکثر ایلو ویرا لگاتے، تاکہ چہرہ چمکتا رہے۔ دادا پوری طرح خوش مزاج اور امن پسند تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اسمارٹ اور رعب دار دیکھنا چاہتے تھے۔''

مرزا صاحب کی بہو، صفیہ قمر الحسن بیگ کے مطابق، ''ڈیڈی کافی اسمارٹ اور خوبصورت آدمی

تھے، جن کو دیکھ کر لوگ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ ڈیڈی ذاتی صاف صفائی پر ہمیشہ دھیان دیتے اور بناؤ سنگار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی جلد کو چمکانے کے لیے ایلو ویرا کا استعمال کرتے تھے۔ سلمٰی خالہ (اِرم کی والدہ) ان کو اچھی کوالٹی کا ایلو ویرا بھیجتیں، جس کے بارے میں وہ کہتے کہ یہ سلمٰی کا کرشمائی ایلو ویرا ہے۔ ایلو ویرا کا استعمال وہ صرف اپنے چہرے کو ہی چمکانے کے لیے نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی بیوی کی جلد پر بھی لگاتے تھے۔ ان کا چہرہ ہمیشہ چمکتا رہتا تھا، دانت پوری طرف صاف، مضبوط اور چمکتے رہتے۔''

ڈاکٹر وِشالی ککڑ مہتا کہتی ہیں، ''میں نے کبھی بھی ایسے شوہر کو نہیں دیکھا، جو اپنی بیوی کی آرائش و زیبائش میں بھی اتنی ہی دلچسپی لیتا ہو۔ وہ ہمیشہ کلین شیور رہتے، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھیاں کی ہوئی ہوتیں۔ ان کی صاف ستھرائی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنے جسم پر کبھی کوئی خوشبودار مادّہ نہیں لگایا، اور ہمیشہ صاف کپڑوں میں ملبوس رہتے۔ میرے لیے وہ ایک شاندار آدمی تھے، جو جسم کی صفائی پر پورا دھیان دیتے۔ وہ ان لوگوں سے بڑی نفرت کرتے تھے، جو اپنی ظاہری شکل وصورت کو لے کر بے پروا ہوتے اور اس پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ 'داڑھی بڑی ہو تو حجامت بنایئے، دونوں کو پھر ملا کے سارنگی بجایئے'، وہ اکثر یہ لائنیں گنگناتے رہتے، تاکہ سامنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی گندی شکل وصورت سے دوسروں کو پریشانی ہو رہی ہے۔ بیگ صاحب اور ان کی اہلیہ کو فزیو تھیراپی کرانے کے لیے میں روزانہ شام کو ان کے گھر جاتی، جہاں میں انھیں ہمیشہ سرگرم طرزِ زندگی پر عمل پیرا پاتی تھی۔''

مرزا فرید الحسن بیگ چین سے کامیاب کریوسرجری کرا کر واپس لوٹنے کے بعد اپنے پوتے / پوتیوں کے ہمراہ

پیارے دادا/نانا

مرزا فرید الحسن بیگ نے جہاں ایک طرف زندگی کے سنگین مسائل کو حل کرنے میں اپنی تیز دماغی کا مظاہرہ کیا، وہیں دوسری طرف فیملی کے کم عمر لوگوں کے ساتھ بے انتہا شفقت و محبت بھی دکھائی۔ فیملی کے ہر ایک رکن کے ساتھ ان کا ایک خاص رشتہ ہوا کرتا تھا۔

اصل میں، فیملی کے ہر چھوٹے ممبر نے، چاہے وہ فضا بیگ ہوں، حرا بیگ، ابرار بیگ، سارہ بیگ، عفرہ بیگ، حامدی بیگ، الیزہ بیگ، اذہان بیگ، حمزہ بیگ، طہ بیگ، سومیا گپتا، کاویا گپتا، حیات خان یا ادیبہ خان ہوں، سبھی نے ان کے ساتھ بڑے مزے کیے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو پرسنل، اسپیشل اور خوش رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک چلے جاتے تھے۔ چاہے وہ پیسے کا معاملہ ہو، جذبات کا معاملہ ہو یا پھر کسی اور قسم کی مدد، ہر معنوں میں وہ ہم سب کے پیارے دادا/نانا تھے۔

ان کے مسائل کو حل کرنا اور بہتر مستقبل کے لیے انھیں تیار کرنا، دادا کی سب سے بڑی ترجیح تھی۔ انھوں نے ہر ایک کی فراست کو پہچان کر اسے ایک خاص نام دیا تھا۔

مرزا صاحب کی پوتی سارہ بیگ، جو اُن کے سب سے بڑے بیٹے مرزا شمس الحسن بیگ کی صاحبزادی ہیں، کہتی ہیں، ''دادا مجھے 'آرکی ٹیکٹ' پوتی کہتے تھے، کیوں کہ آرکی ٹیکچر کو میں اپنا کریئر بنانا چاہتی تھی اور وہ بھی مجھے ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد، میں تقریباً ہر روز دادا سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اگر کبھی میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی ہوتی، تو وہ میرے پاس آتے اور پوچھتے کہ کیا مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں انھیں اپنی پریشانی کے بارے میں نہ بھی بتاتی، تو وہ میری اس ضرورت کو بھانپ لیتے۔ میں نے انھیں صرف دوسروں کے لیے زندگی گزارتے ہوئے پایا۔''

سارہ بیگ کے بھائی حمدی بیگ ایک مزیدار واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''ایک بار میرے والدین عمرہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں مجھے ان کی بڑی یاد آرہی تھی اور میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ دادا کو میری اس پریشانی کا علم ہو گیا، لہٰذا انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چیز پریشان کر رہی ہے۔ انھوں نے پیار سے مجھے گلے لگایا اور حالات کا سامنا کرنے کے بارے میں بتایا۔ ان کے اس مشورہ کا میرے اوپر جادوئی اثر ہوا اور چند ہی منٹوں کے اندر میں ٹھیک ہو گیا۔''

سومیا گپتا بتاتی ہیں کہ اگر نانا (مرزا صاحب) ان کی زندگی میں نہ ہوتے، تو اُن کے اندر اتنی عاجزی و انکساری نہ ہوتی، جتنی کہ آج ہے۔ مرزا صاحب کی سب سے بڑی بیٹی، نشاط گپتا کی صاحبزادی، سومیا گپتا کہتی ہیں، ''لوگ اپنی زندگی میں سپر مین، اسپائڈر مین یا پھر ایسی ہی کوئی بڑی شخصیت بننا چاہتے ہیں، لیکن میں اپنے نانا جیسا بننا چاہتی ہوں، جنھوں نے مجھے سب سے پہلے انسان بننا سکھایا۔ انھوں نے ہمیں مذہبی ہونے اور سیکولر ہونے کا فرق بتایا۔ مذہبی شخص کے طور پر آپ اپنے مذہب میں یقین رکھتے ہیں، لیکن ایک سیکولر انسان کے طور پر آپ کا یقین صرف اپنے مذہب میں ہی نہیں ہوتا، بلکہ آپ دوسروں کے مذاہب کا بھی احترام کرنے لگتے ہیں۔''

سومیا نے مزید کہا کہ ''آج کی دنیا میں، جہاں چاروں طرف بے ایمانی کا دور دورہ ہے، مختلف قسم کے مسائل ہیں، ایسے میں انھوں نے کیسے سچائی کا راستہ اختیار کیا، وہ واقعی میں قابل تعریف ہے۔''

مرزا فرید الحسن بیگ کو کس چیز نے سلجھا ہوا انسان بنایا، اس کے بارے میں بتاتے ہوئے نشاط گپتا کی چھوٹی بیٹی، کاویا گپتا کہتی ہیں، ''ان کا ایپروچ پوری طرح ماڈرن تھا، جس نے انھیں سلجھا ہوا انسان بنایا۔ چیزوں کو ردِعمل کے طور پر سیدھے سیدھے ٹھکرانے کے بجائے، وہ ہمیشہ اس کی اچھائیوں اور برائیوں کو پرکھتے تھے، پھر کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے آدمی تھے اور ہمارے ساتھ بغیر کسی پس وپیش کے چیزیں شیئر کرتے تھے۔''

مرزا صاحب کے کردار کی ایک اور خوبی ان کے ذریعہ دوسرے عقائد کا احترام کرنا بھی تھا۔ کاویا مزید کہتی ہیں، ''انھوں نے ہمیں سکھایا کہ سوچ کی آزادی کیا ہوتی ہے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ انھوں نے میری ممی کی شادی اپنی برادری اور مذہب سے باہر کی، جس کے بارے میں دو دہائی پہلے سوچنا بھی تقریباً ناممکن تھا۔''

فضا بیگ کے مطابق، مرزا صاحب ایسے آدمی تھے، جو وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کے بیٹے مرزا قمر الحسن بیگ کی بڑی بیٹی، فضا بیگ کہتی ہیں، ''وہ (دادا) چاہتے تھے کہ بچے کے سامنے ساری چیزیں پیش کر دی جائیں، تاکہ وہ خود ہی ان میں سے اپنے لیے انتخاب کر سکیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسروں کی زندگی میں کوئی دخل اندازی کرے۔ انھیں بچوں کی فہم پر پورا یقین تھا کہ وہ اپنا راستہ خود ہی تلاش کر لیں گے۔ جب یہاں ڈومینوز کھلا، تو وہ ہم بچوں کو وہاں پزّہ کھلانے لے جایا کرتے تھے۔ بچے جب پزّے سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے، تو وہ انھیں فاسٹ فوڈ کے فوائد اور سائڈ افیکٹ کے بارے میں بھی بتاتے رہتے۔''

فضا بیگ کی چھوٹی بہن، حرا بیگ کہتی ہیں، ''دادا نے میری ہر طرح سے مدد کی۔ انھوں نے میڈیکل پروفیشن کو اپنانے اور ڈاکٹر بننے میں میری حوصلہ افزائی کی۔ ایک بار میں ممی سے ناراض ہو گئی تھی اور غصے سے میں نے دروازے کو زور سے مارا تھا۔ ممی نے غصہ میں آکر مجھے تھپڑ مار دیا۔ دادی نے یہ بات دادا کو بتا دی کہ بہو (میری ممی) نے مجھے مارا ہے۔ دادا کو برداشت نہیں ہوا اور وہ کافی ناراض ہو گئے۔ فوری طور پر مجھے منانے کے لیے وہ میرے لیے آئس کریم لے کر آئے اور اس وقت تک انتظار کرتے رہے، جب تک میرے چہرے پر مسکان نہیں آ گئی۔ وہ جذباتوں کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔''

اچھے کریئر کے لیے بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ، مرزا صاحب ان کے چہروں پر مسکان لانے کی بھی ہمیشہ کوشش کیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی سالی، رُباب خان، جو ایک ڈجیٹل اینالیٹک ہیں اور بینکنگ صارفین کے لیے کام کرتی ہیں، بتاتی ہیں کہ ''ایک بار کسی کا برتھ ڈے منایا جا رہا تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ گلی کے دو بچے باہر سے جھانک رہے ہیں اور کیک کاٹنے کے پروگرام کو لالچ سے دیکھ رہے ہیں۔ فیملی ممبران اور وہاں موجود دیگر مہمانوں کی کوئی پروا کیے بغیر، وہ خاموشی سے اٹھے اور باہر جا کر اُن بچوں کو اپنے ساتھ اندر لے آئے۔ جشن میں ان بچوں کو بھی شامل کر لیا گیا، انھیں کیک اور کھانے کی دوسری چیزیں دی گئیں۔ ان بچوں کو بڑا مزہ آیا اور ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ان کا یہ جذبہ انکساری دیکھ کر میں کافی متاثر ہوئی کہ انھوں نے اپنی شبیہ کی بھی پروا نہیں کی اور گلی کے بچوں کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لیے اپنے دل کی بات مانی۔''

مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی، صبا خان کے صاحبزادہ حیات خان (جو ایک کھلاڑی ہیں اور جنھوں نے ایک بار ہریانہ کے خلاف اسٹیٹ لیول میچ کھیلا تھا، جس میں ان کی ٹیم جیتی تھی) ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''مجھے ایک واقعہ یاد ہے، جب میرے نانا نے مجھے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ میں فٹ بال کھیلنے والے ایک گروپ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ کچھ لڑکوں نے حسد کے مارے فٹ بال کھیلنے کے میدان کے چاروں طرف باڑ لگا کر ہمارے کھیل میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں کافی پریشان ہوا، لہٰذا میں نے یہ بات نانا کو بتائی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں خود اُن لڑکوں سے جا کر ملوں، انھیں فٹ بال کے ایک اچھے میدان کے فائدے بتاؤں اور یہ بھی بتاؤں کہ ہمیں سرسبز میدان کی دیکھ ریکھ کیسے کرنی چاہیے۔ میں نے دوستانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے وہی کیا، جو نانا نے مجھ سے کہا تھا۔ اس نے واقعی میں جادو کی طرح کام کیا اور اُن لڑکوں نے وہ باڑ ہٹالی، جو انھوں نے ہمیں کھیل سے روکنے کے لیے تیار کی تھی۔''

حیات کی بہن، ادیبہ خان کہتی ہیں، ''ایک بار مجھے امتحان میں بہت کم نمبرات ملے۔ اس کی وجہ سے گھر پر سبھی نے مجھے ڈانٹ پلائی، لیکن نانا نے مجھے سمجھا اور اُلٹے ان سبھی لوگوں کو ڈانٹا۔ نانا کے الفاظ میرے لیے اتنے حوصلہ افزا ثابت ہوئے کہ میں نے کڑی محنت کی اور اگلی بار امتحان میں اچھے نمبر لے کر آئی۔''

حمزہ بیگ کے مطابق، مرزا صاحب بچوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، چاہے کام کتنا ہی مشکل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو۔ مرزا احمر بیگ کے صاحبزادہ حمزہ بیگ بتاتے ہیں، ''ایک بار مجھے این سی سی کے ایک دورہ پر جانا تھا۔ مجھے اپنے جوتے صاف کرنے اور دوسرے کاموں کو اپنے ہاتھوں سے کرنے میں شرم آ رہی تھی۔ اسی پس وپیش کی حالت میں، میں نے دادا سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مجھے ایسے ٹور کے فوائد بتائے اور مشورہ دیا کہ میں اپنے کام خود سے کروں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ میں نے اپنے من میں کوئی بھی منفی خیال پیدا کیے، سارے کام خود ہی کیے، جس سے اس ٹور میں مجھے بڑا مزہ آیا۔''

حمزہ بیگ کے چچیرے بھائیوں/بہنوں میں سب سے چھوٹی، الیزہ بیگ دادا کو سلجھا ہوا انسان بتاتی ہیں، جنھوں نے ان کو زندگی میں انکساری سکھائی۔ ظفر بیگ کی صاحبزادی، الیزہ بیگ کہتی ہیں، ''ایک بار بندر کا ناچ دکھانے والا نٹ ہمارے علاقے میں آیا۔ ہر آدمی تربیت یافتہ اس مندر کا تماشہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ کچھ ہی دوری پر چند غریب بچے کھڑے تھے، چونکہ ان کے پاس پیسے نہیں تھے، اس لیے وہ بندر کا تماشہ دیکھنے سے قاصر تھے۔ ہم تو بندر کے ناچ کا مزہ لے رہے تھے اور ان بیچارے بچوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ دادا نے جب یہ دیکھا، تو وہ ان بچوں کے پاس گئے اور انھیں کچھ پیسے دیے، جس سے وہ بھی اس تماشہ کا لطف اٹھانے میں کامیاب ہوئے۔''

الیزہ مزید کہتی ہیں، ''میرا چچیرا بھائی حمزہ، اکثر لاپروائی سے چپل الٹے پیر میں پہن لیتا تھا۔ میں اس کی اس لاپروائی کو برداشت نہیں کر پاتی تھی اور ہمیشہ اسے ٹوکتی اور اس کی غلطی کو سدھارتی تھی۔ دادا نے حمزہ سے کہا کہ 'لیزو' اتنا چھوٹا ہو کر بھی اپنے کام ٹھیک ڈھنگ سے کرتا ہے، جب کہ حمزہ اس سے بڑا ہونے کے باوجود اپنی چیزیں ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کر سکتا۔ دادا کی اس بات پر اسے شرم آئی اور پھر اس نے کبھی غلطی نہیں کی۔''

بقول عفرہ بیگ، ''دادا نے ہر طرح سے میری مدد کی اور ہمیشہ کی۔ وہ ایک نہایت جدید انسان اور کھلے ذہن کے مالک تھے۔ جب کبھی مجھے یہ لگتا کہ میں جو چیز کرنا چاہتی ہوں، میرے والدین اس کی اجازت نہیں دیں گے، تو میں دادا سے اس کی اجازت لے لیتی تھی۔ اس کے بعد مجھے کسی اور سے

اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔''

مرزا ابرار بیگ کہتے ہیں،''ان کے اندر عاجزی وانکساری اس حد تک تھی کہ وہ سڑک سے کچرا اٹھا کر کوڑے دان میں ڈالنے سے شرماتے نہیں تھے۔ ویٹیکن شہر میں ہم ایک گرجا گھر میں گئے، جہاں پر چرچ پلازہ کے فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ دادا نے اسے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور ایسا کرتے وقت انھیں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان عمر کا ایک بڑا فرق تھا، لیکن میں نے اسے کبھی محسوس نہیں کیا۔ دادا نے میرے والدین کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ مجھے ناسا، امریکہ میں اپنے اسکول کی نمائندگی کرنے دیں۔ ہم نے ہندوستان کے اندر یا ملک سے باہر جتنے بھی سفر کیے، ان سب میں دادا ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتے، ہمارے دوست کی طرح۔''

نور جہاں خانم اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے ہمراہ

وراثت کے نگہبان

مرزا فرید الحسن بیگ کی شخصیت ایسی تھی، جو مشکل سے ہی پائی جاتی ہے۔ ان کے شاندار کردار پر نظر ڈالیں، تو ان کے اندر جو قدریں تھیں، ویسی لاکھوں میں سے کسی ایک میں ملتی ہیں۔ وہ بہت تیز دماغ اور عقلمند ذہن کے مالک تھے اور ہر مسئلہ کی گہرائی تک آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ ان کا دل اتنا نرم تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے پوری انسانیت کے لیے فکرمند رہتے۔ وہ ہر ایک کی فلاح کے بارے میں سوچا کرتے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کی بات ان کے ذہن و دماغ کے کسی بھی کونے میں موجود نہیں تھی۔ ایسا خیال کبھی ان کے دماغ میں آیا ہی نہیں۔ جن لوگوں نے انھیں تکلیف پہنچائی، ان کے ساتھ بھی وہ صبر و تحمل اور پیار محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کا اندازِ گفتگو اتنا شاندار تھا کہ لوگ بات کرنے کے لیے خود بخود ان کے پاس کھنچے چلے آتے تھے۔

بیگ صاحب ہمیشہ پختگی اور خوبصورتی کے متلاشی رہے۔ اس کی مسلسل جستجو ہی ان کی زندگی کی خوبصورتی تھی۔ خوبصورتی اور پختگی کی جستجو نے ہی باغوں اور پھولوں میں ان کی دلچسپی بڑھائی اور وہ

مصوری، موسیقی اور خطاطی کے بہترین نمونوں کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے۔

بیگ صاحب کا مذہبی عقیدہ کنارہ کشی اختیار کرنے والا یا سب سے الگ ہٹ کر نہیں تھا، بلکہ ان کا پختہ یقین یہ تھا کہ اللہ کی بادشاہت اور اس کی رحمتیں تمام جہانوں کے لیے ہیں۔ مزید برآں، ان کا مذہبی عقیدہ کٹر پن یا سخت گیری پر مشتمل نہیں تھا۔ ان کی توجہ اور سرگرمی کا محور فردِ واحد تھا۔ وہ فردِ واحد، جو اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اِس دنیا میں بھی اور یہاں کے بعد بھی۔ تاہم، بیگ صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ یہ دنیا انسانوں کے عمل کرنے کی جگہ ہے، جہاں وہ وسیع انسانی معاشرہ کا حصہ رہتے ہوئے اخلاقی اور روحانی طور پر ترقی کر سکتا ہے۔ اسی لیے، انھوں نے اپنے مذہبی فریضہ کے طور پر سماجی باز آبادکاری اور عوامی فلاح کے مشن پر کام کرنا شروع کیا۔ وہ ایک مسلمان تھے، جو قرآنی تعلیمات اور نبیؐ کی احادیث کو انفرادی اور مجموعی زندگی کے مسائل کا بہترین علاج اور معاشرے کی اخلاقی و روحانی صحت کا بہترین ذریعہ تصور کرتے تھے۔

اتنے گہرے معنی اور زندگی کے مقصد کو سمجھنے کے بعد، ان کی خواہش یہی تھی کہ ان کے بچے (چار بیٹے اور دو بیٹیاں) بھی ان کے ذریعہ تعمیر کردہ اس وراثت کو آگے لے جائیں، تاکہ وہ بھی ایک بامعنی زندگی گزار سکیں اور سخاوت کے کام کو انجام دیتے ہوئے، وہ بھی اپنے والد کی طرح کامیاب بن سکیں اور اللہ کے فضل و کرم سے اس دنیا اور آخرت میں بھی لطف اندوز ہو سکیں۔

رامیشور ناتھ شریواستو کے مطابق، مرزا صاحب زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب تھے۔ ''مرزا صاحب نے اپنے بچوں کو ایک صحت مند ماحول عطا کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہی ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو کام کرنے اور آگے بڑھنے کا بھرپور موقع دیا، جو کہ ان کی محنت و صلاحیت پر مبنی تھا۔ انھوں نے ان کو سکھایا تھا کہ 'حرکت میں برکت ہے۔''

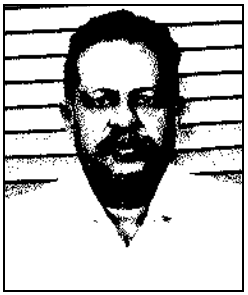

مرزا شمس الحسن بیگ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی

مجھے گھر پر پالتو جانوروں اور چڑیوں کو رکھنے کا شوق تھا۔ اسی لیے مجھے ایک پنجڑے یا پالتو جانوروں کے لیے ایک گھر کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ایک بار میں چپکے سے جامعہ کیمپس سے لوہے کی ایک چھڑ اٹھالایا۔ شام کو ڈیڈی کی نظر اس پر پڑی، تو انھوں نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے سچ سچ بولتے ہوئے کہا کہ میں اسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کیمپس سے اٹھا کر لایا ہوں۔ وہ غصہ سے بھر گئے اور میری پیٹھ پر زور سے تھپڑ مارا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اسے جہاں سے اٹھا کر لایا تھا، وہیں لے جا کر رکھ دوں۔ یہ ایک بڑا سبق تھا جو تھپڑ کھا کے ملا، لیکن اس نے مجھے یہ عہد لینے پر مجبور کر دیا کہ میں زندگی میں کبھی کوئی چیز نہ چراؤں۔

ایک بار مجھے اپنے گھر کے آس پاس بڑھتی ہوئی جھگیوں کی تعداد سے کافی پریشانی ہونے لگی۔ ان جھگیوں کو بار بار گرا دیا جاتا تھا، اس کے باوجود ہر بار نئی جھگیاں بنا دی جاتی تھیں۔ مجھے کافی غصہ آیا

اور میں نے غصے کی حالت میں کہا کہ ان جھگیوں میں رہنے والوں کو زندہ جلا دینا چاہیے۔ ڈیڈی نے یہ سن لیا اور غصے میں مجھ سے کہا، ''ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اندر سے انسانیت کا جذبہ مر چکا ہے۔''

چونکہ میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی، لہٰذا پانچ سال تک جونیئر انجینئر کے طور پر کام کرنے کے لیے میں لیبیا چلا گیا۔ میں جب ملک واپس آیا، تو ماں نے مجھ سے کہا کہ ڈیڈی ایک بینک بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس راستے میں انھیں چنوتیاں اور مسائل پیش آ رہے ہیں، جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان ہیں۔

میں نے اس کے بارے میں تفتیش کی اور چاہا کہ اس کام میں ان کی مدد کروں۔ انھوں نے مجھے پروسیسنگ اور دیگر کارروائیوں کو انجام دینے کی ذمہ داری سونپی، خاص کر پروجیکٹ کے لیے اجازت ومنظوری اس طرح حاصل کرنے کے لیے کہا، جس سے کم سے کم پیسہ خرچ ہو۔

احتیاط کے طور پر، انھوں نے مجھے سرکار کو ٹیکس کا پورا پورا پیسہ ادا کرنے کے لیے کہا اور پانی، بجلی یا سروِس سے متعلق سسٹم میں کسی بھی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرنے سے منع کیا۔

میرے ڈیڈی بھرپور زندگی جیتے تھے۔ مشکل دنوں میں بھی وہ تھوڑے بہت اچھے کھانوں کا انتظام کرتے اور فیملی کے لیے جتنا کچھ بھی بہتر ہو سکتا تھا، اسے کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ کھانے کے شوقین ہونے کے ناتے، وہ یہ جانتے تھے کہ ذائقہ دار کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہ ہر ممکن موقع پر فیملی کے ہم تمام لوگوں کو باہر گھمانے لے جاتے اور ہماری چھٹیوں کو مزیدار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

میرے والد کے ایک دوست تھے، جن کا نام رضاء الحسن خان تھا، جنھوں نے میری والدہ کو مرزا صاحب اور ان کے درمیان باہمی رشتوں کو حسین اور خوش گوار بنانے کا یہ ماسٹر فارمولہ بتایا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر آپ ان کو کھانا نہیں پیش کریں گی، تب بھی ان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن اگر آپ نے ان کے سماجی کاموں میں دخل اندازی شروع کر دی، تو آپ کی شادی شدہ زندگی عذاب بن جائے گی۔ میری ماں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور ڈیڈی کو اپنے سماجی کاموں کو انجام دینے کی پوری آزادی مہیا کی۔

میری بہن صبا، جب پوری طرح بولنے لائق ہوگئی، تو انھوں نے کہا کہ یہ تمہاری ماں کا حوصلہ اور قربانی تھی کہ گونگی اور بہری ہونے کے باوجود صبا اَب بولنے لگی ہے۔ اس میں میرا کوئی رول نہیں ہے۔

وہ مسلم قوم کے لیے فکرمند تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ جس ملک میں رہتے ہیں، آپ کو وہاں کے قانون پر عمل کرنا چاہیے۔ آپ قانون کو بدلنے کی لڑائی تو لڑ سکتے ہیں، لیکن قانون کو توڑ نہیں سکتے۔

میرے ڈیڈی جب تک زندہ رہے، صبح میں جلدی سو کر اٹھنا، فجر کی نماز ادا کرنا، اپنے والدین کو ورزش کرانا، ان کا شوگر چیک کرنا، انھیں چائے دے کر واپس آنا، یہی میرا معمول تھا۔ اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اپنی والدہ کے ساتھ بھی میں اسی معمول پر قائم ہوں۔ حالانکہ، انھوں نے اپنے بچوں کو ایک بامعنی زندگی بسر کرنے کی تربیت دی تھی، لیکن مجھے ان کی بہت یاد آتی ہے۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آخرت میں ان کو ایک اعلیٰ اور آرامدہ مقام عطا کرے۔

آمین۔

سعدیہ شمس الحسن بیگ

ایکانومکس میں ماسٹرس، جامعہ کوآپریٹو بینک کے ابتدائی مرحلہ میں اپنا تعاون دیا

ڈیڈی کے ساتھ میری پہلی ملاقات میرے شوہر کی بھتیجی کے توسط سے ہوئی۔ اس کے بعد ہم دونوں فیملی کے ایک مشترکہ دوست کے ذریعہ شادی کی بات چلی۔ مجھے دیکھنے ممی اور ڈیڈی، دونوں آئے۔ کچھ دیر بعد، جب ڈیڈی وہاں سے واپس روانہ ہونے والے تھے، تو انھوں نے اپنی منظوری کے طور پر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

میری شادی ہوئی اور میں اس گھر میں آ گئی۔ حمل کے دوران جب اُن کو پتہ چلا کہ جڑواں بچے پیدا ہونے والے ہیں، تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ مجھے اچھے سے اچھا پھل، کھانے کی دیگر اشیاء، جوس وغیرہ ہمیشہ لا کر دیا کرتے۔ ایک طرف جہاں میری دیکھ بھال کے لیے میرے شوہر موجود تھے، وہیں دوسری طرف میرے سسر بھی ایک حاملہ عورت کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب مجھے مہیا کرانے کے لیے وہاں موجود تھے۔ مجھے لگتا کہ میں ایک شہزادی ہوں، جس کے سامنے اس کے

خواہش کی ہر چیز موجود ہے۔ مجھے صرف زبان کھولنی ہے اور پلک جھپکتے ہی میرے سامنے سب کچھ موجود۔

جب میرے بچے (جڑواں) پیدا ہوئے، تو ہر صبح میں ان بچوں کو لے جا کر ان کی گود میں دے دیتی اور وہ ان کا اتنا اچھا خیال رکھتے، جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسے تھے میرے سسر مرزا فرید الحسن بیگ۔

جامعہ کوآپریٹو بینک کی تشکیل کے ابتدائی مرحلہ میں، میں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ وہ لوگوں کی تعلیمی صلاحیتوں سے زیادہ انھیں خود مختار بنانے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ آدمی کو اپنی روزی روٹی کمانے اور سماج کو فائدہ پہنچانے کے لائق ہونا چاہیے۔

میرے والد کی چونکہ ٹرانسفر والی نوکری تھی اور ان کے پاس فیملی کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا، اس لیے میں اپنے والد کے اتنا قریب نہیں ہو سکی، جتنا کہ ڈیڈی کے۔

اللہ انھیں ان کے نیک اعمال کی پوری جزا عطا فرمائے۔

آمین!

مرزا قمر الحسن بیگ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی

دنیا تو مٹ نہ جائے گی تیرے بغیر بھی
لیکن یہ کیا کہ تیری ضرورت بھی کم نہیں

دنیا کے عام بچوں کی طرح، میں بھی ایک ایسا بچہ تھا، جو زندگی کے اسرار و رموز سے خود ہی پردہ اٹھانا چاہتا ہے، تاکہ اس کے بے چین دل کو قرار آ سکے۔ لیکن چونکہ مجھے اپنے آس پاس کی چیزوں کا زیادہ علم نہیں تھا، اس لیے مجھے ایک ایسے گائڈ، رہنما، دوست اور راہبر کی ضرورت تھی، جو میرا ہاتھ پکڑ لے اور اپنی تجربہ کار آنکھوں سے مجھے دنیا کا مشاہدہ کرائے۔

میں نے ڈیڈی میں ایسا انسان پایا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے میری تعلیم و تربیت کی، کبھی نرمی سے تو کبھی سختی سے۔ لیکن انھوں نے جو بھی طریقہ اپنایا، وہ میری ہی بہتری کے لیے تھا۔

جب میں بڑا ہو رہا تھا، اس وقت میری دو بار جم کر پٹائی ہوئی۔ پہلا واقعہ اُس وقت کا ہے، جب

ذاکر باغ کی تعمیر کا کام شروع ہوا تھا۔ ایک صاحب ڈیڈی کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ بیگ صاحب، آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ آپ کو آنے جانے میں دقت پیش آ رہی ہوگی۔ چلئے میں آپ کو اپنی طرف سے ایک کار بھیج دیتا ہوں۔ ڈیڈی نے ان کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ انھیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا اور ان کی بات چیت کو بہت غور سے سن رہا تھا۔ مجھے اس کی اس پیشکش پر لالچ آیا، یہ سمجھے بغیر کہ وہ آدمی ذاکر باغ میں ایک فلیٹ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ رشوت میں کار دے کر وہ ڈیڈی کو ان کے اصولوں سے ڈگمگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے ڈیڈی سے کہا کہ یہ اتنی اچھی پیشکش ہے کہ ہم آسانی سے کار حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈیڈی کافی ناراض ہوئے، کیوں کہ وہ پہلے ہی اس آدمی کی اس گھناؤنی حرکت سے کافی تنگ آ چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے میری جم کر پٹائی کی اور شمشیر بھائی، جو کہ میری فیملی کے ایک ممبر کی طرح ہی تھے، انھوں نے آ کر مجھے بچایا۔

مجھے یاد ہے، ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا، ''تعلیم ہے، تو بڑا سوچ سکتے ہو۔ جذبہ ہے، تو بڑا کام کر سکتے ہو۔ لیکن تعلیم اور جذبہ دونوں ہو، تو بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہو۔'' اِن الفاظ کو ذہن میں رکھ کر میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور انجینئر بن گیا۔ میں نے اپنی والدہ سے اجازت چاہی، جنھوں نے ڈیڈی کو کاروبار کرنے سے متعلق میرے ارادے کے بارے میں بتایا۔ ڈیڈی نے یہ کہتے ہوئے اپنی رضامندی دینے سے انکار کر دیا کہ دنیا میں کوئی بھی بے ایمانی کیے بغیر اپنے کاروبار کو نہیں چلا سکتا۔

آخر کار، انھوں نے بے دلی سے مجھے آگے قدم بڑھانے کے لیے کہا، لیکن یہ کہا کہ میں کوئی کام ان کا نام لے کر حاصل نہ کروں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اس بات کو میں ذہن میں رکھوں گا۔

ہم نے پوری ایمانداری کے ساتھ محنت کی۔ آہستہ آہستہ ہمارا کام خود بولنے لگا اور ڈیڈی کو بھی اس کے بارے میں پتہ چلا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اس طرح میرے اوپر ان کا اعتماد بحال ہوا۔ میں ہمیشہ ڈیڈی کو مسائل سے گھرا ہوا دیکھتا، لیکن وہ ان مسائل کو کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ چونکہ ان کی ٹریننگ سوشل ورک میں ہوئی تھی، اس لیے حالات کو بہتر ڈھنگ سے قابو میں کرنا ان کے

لیے آسان تھا۔

ان کا منتر یہی تھا کہ ''پریشانیوں کو اوڑھو مت، بلکہ سالیوشن ڈھونڈو۔ پریشانیوں کو اِنجوائے کرنا سیکھو۔''

انھوں نے جب رہائشی سوسائٹی کا نام ذاکر باغ رکھا، تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ باغ متعدد پودوں اور درختوں کے ایک خوبصورت مجموعہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں کو راحت ملتی ہو اور جو انسانوں کے لیے فائدہ مند ہو۔ ایک باغ کی طرح ہی انھوں نے پورے احتیاط اور پختگی کے ساتھ متعدد لوگوں کو یہاں لاکر بسایا۔ ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں، آئی پی ایس، آئے اے ایس، کاروباری، سیاست داں، جنوبی اور شمالی ہندوستان کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، درج فہرست ذات۔ انھوں نے کہا کہ اگر مسلمان صرف اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ زندگی گزارتے رہیں گے، چھوٹی اور گندی بستیوں میں رہیں گے، تو ان کے دماغ بھی گندی بستیوں جیسے ہو جائیں گے۔

ذاکر باغ ایک مجموعی اور بہتر بود و باش کا نمونہ تھا۔ یہ ایک چھوٹے ہندوستان کی طرح تھا، جہاں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔

ایک بار میں اپنے دوست دیوندر راوت، ڈیڈی اور امی کے ساتھ حیدرآباد کے سفر پر گیا۔ حسب معمول اس سفر کے دوران بھی، ڈیڈی جب بھی ٹیکسی میں بیٹھتے، تو ٹیکسی ڈرائیور سے اس کے پیشہ کے بارے میں دریافت کرتے، اور یہ پوچھتے کہ کیا وہ کرایے پر ٹیکسی چلا رہا ہے یا خود اس کا مالک ہے۔ انھوں نے کئی ٹیکسی ڈرائیوروں سے یہ بات پوچھی اور سب نے یہی کہا کہ وہ ڈرائیور نہیں ہے، بلکہ ٹیکسی کا مالک ہے۔ ڈیڈی نے ان سے مزید سوال کیا کہ اس نے ٹیکسی کیسے حاصل کی۔ انھیں جواب ملا کہ وہاں بہت سے کوآپریٹو بینک ہیں، جو آسان قسطوں پر قرض (لون) فراہم کرتے ہیں۔ لوگ اپنی ٹیکسیوں کو فائنس کرواتے ہیں، اور کچھ سالوں بعد ان گاڑیوں کے مالک بن جاتے ہیں۔

اس واقعہ نے ڈیڈی کے ذہن میں ایک نئے خیال کو جنم دیا۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ اگر یہ ساری چیزیں حیدرآباد میں ممکن ہیں، تو اسے دہلی میں کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

ہم دہلی واپس آ گئے۔ ڈیڈی اگلے ہی دن کوآپریٹو سوسائٹی کے دفتر میں پہنچ گئے۔ انھوں نے متعلقہ کلرک سے کہا کہ وہ انھیں ایک فارم دے، تاکہ وہ ایک بینک بنا سکیں۔ فارم کے لیے انھیں اگلے 15 دنوں تک دوڑنا پڑا۔ پندرہویں دن ڈیڈی نے اس کلرک سے کہا کہ اگر تم مجھے فارم نہیں دے سکتے، تو برائے کرم بتا دو کہ فارم کہاں سے ملے گا؟ اس نے کہا کہ پورے آفس میں ایک بھی فارم نہیں ہے اور پچھلے 22 سالوں میں یہاں نئے بینک کے رجسٹریشن کے لیے ایک بھی درخواست نہیں آئی ہے۔

چند ہفتوں تک یونہی دوڑتے رہنے کے بعد ڈیڈی کو آخر کار ایک فارم دیا گیا۔ انھوں نے اسے بھر کر جمع کر دیا۔ رجسٹریشن کے ضابطوں کے مطابق، اس وقت 20 لاکھ کے شیئر کیپٹل اور 1000 ممبران کی ضرورت تھی، لیکن جب لمبے عرصے کے بعد ہماری باری آئی، تو یہ ضابطے بدل گئے اور اب ہمیں 60 لاکھ روپے کے شیئر کیپٹل اور 3000 ممبران کا انتظام کرنا تھا۔

تین ہزار ممبران کو جمع کرنے میں ہمیں 9-8 مہینے لگ گئے اور آخر کار اکتوبر 1995 میں بینک کا رجسٹریشن ہوا۔

ان تمام کاموں کے علاوہ، انھوں نے فیملی کو بھی پوری توجہ دی۔ وہ میرے چہرے کو آسانی سے پڑھ لیتے تھے اور جب بھی انھیں یہ محسوس ہوتا کہ میں کام کے دباؤ کی وجہ سے پریشان ہوں، تو وہ مجھے تسلی دیتے اور کہتے کہ پریشانی کا وقت گزر جائے گا۔ اسی لیے بہت زیادہ ناامید اور مایوس مت ہوا کرو، بلکہ چنوتیوں کو قبول کرو۔

وہ ایک عملی آدمی تھے۔ جب انھیں اپنے مرض کا پتہ چلا، تو انھوں نے اس وقت چل رہے اپنے سوشل پروجیکٹوں پر تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک بار ان کو کمزور دیکھ کر میں رونے لگا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا، ''اس دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ کے لیے نہیں آیا۔ یہ بات دل میں رکھو۔ اللہ کی چیز ہے، اللہ کی امانت ہے۔ اگر تم مجھے سچ میں کچھ دینا چاہتے ہو، تو جو چیز بنائی ہے، ان کو اچھے طریقے سے چلاؤ اور جس مقصد سے بنائی گئی ہے، اس مقصد کو پورا کرو۔ جو غریب ہے، جس ضرورت سے آیا ہے، اس کی ضرورت کو پورا کرو۔ اگر کوئی بزنس کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد کرو۔ اگر کسی لڑکی کی شادی ہونی ہے، اس کی مدد کرو، اگر کوئی پڑھنا چاہتا ہے، اس کی مدد کرو۔''

آج، جب کہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، میں انھیں بہت مِس کرتا ہوں۔ لیکن جلد ہی ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ انھیں ہر ممکن طریقے سے راحت پہنچائے، آمین۔

صفیہ قمرالحسن بیگ

میری شادی 1994 میں ہوئی۔ اسی سال میرے والد کا انتقال ہوا تھا، لیکن مجھے ان کی غیر موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوا، کیوں کہ ڈیڈی وہاں موجود تھے، جنھوں نے میرے ساتھ اپنی بیٹی جیسا برتاؤ کیا۔ ڈیڈی مجھے 'چھوٹی بہو' کہہ کر بلاتے۔ اس گھر میں پہلے دن ہی مجھے بہت آرام اور خاص عزت ملی، اور یہ سب ڈیڈی کی وجہ سے تھا، جو خود کچن میں گئے اور میرے لیے ناشتہ بنایا، اور اتنی گرمجوشی اور محبت سے میرے سامنے پیش کیا، جیسا کوئی باپ اپنی بیٹی کے لیے کرتا ہے۔

وہ اتنے اچھے انسان تھے۔ دراصل، ان کا عقیدہ تھا کہ مہمان خدا کی طرح ہوتا ہے۔ ہمارے گھر پر جو بھی آتا، وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے، اس کی خدمت کرتے۔ اور ان مہمانوں کے تئیں اپنی محبت کا اظہار، ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر کیا کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ بنائی گئی اسپیشل چائے سے ہر کوئی لطف اندوز ہوتا۔

صرف میرا ہی نہیں، بلکہ میرے پورے کنبہ کا خیال انھوں نے اپنی فیملی کی طرح رکھا۔ جب

میری بہن کی شادی لگ رہی تھی، تو وہ وہاں میرے والد کی جگہ پر گئے اور میری فیملی کے تئیں اسی طرح کے پیار و محبت کا اظہار کیا، جیسا وہ اپنی فیملی کے ساتھ کرتے تھے۔ میری چھوٹی بہن کے لیے وہ ایک رہنما فرشتہ تھے۔ ان کی رہنمائی سے وہ نہ صرف ایک آرکی ٹیکٹ بنی، بلکہ ان کی لگاتار ہدایت و کوششوں سے اس نے اس میں مہارت بھی حاصل کی۔ وہ اسے نئی جگہوں پر لے کر جایا کرتے اور اسے عصری آرکی ٹیچکر کے بارے میں بھی بتایا کرتے تھے۔ اور پیار سے اسے 'آرکی ٹیکٹ صاحبہ' کہا کرتے تھے۔

ان کا سوشل ورک حالانکہ ان کے لیے کافی اہم تھا، لیکن اس کے باوجود اپنی فیملی کو انھوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ اس بات کو یقینی بناتے کہ اگر ہم میں سے کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، تو وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے اور ہماری ہر طرح سے مدد کرتے۔

وہ ایک ہمدرد انسان تھے۔ انھیں اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں سے کافی انسیت تھی۔ وہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پر بھی انھیں انعام دیتے، ان کی تعریف کرتے اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے۔ جس دن انھیں اسپتال لے جایا گیا، انھوں نے آخری بار میری طرف ہاتھ ہلایا اور اپنے ہاتھوں سے مجھے دعا دی، اس وقت میں محسوس نہیں کر پائی تھی کہ یہ ان کی آخری دعا اور آخری سلام ہے!

میں اپنی پوری زندگی ایسے بڑے دل والے شخص سے کبھی نہیں ملی۔ ان کی فطرت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انسان دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں ان کی گرم جوشی، پیار اور محبت کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ میں اللہ سے ان کی مغفرت چاہتی ہوں کہ اللہ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔

''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

مرزا ظفر بیگ

ذاکر باغ کی تعمیر کے وقت، وہاں بانس کا ایک بڑا گٹھر عمودی کھڑا تھا۔ ایک مزدور ان بانسوں کو ہٹا رہا تھا، تبھی وہ گٹھر گر پڑا، جس میں دب کر اس کی موت ہوگئی۔ وہاں پر موجود ہر کوئی گھبرا گیا کہ مزدور کی موت سے کافی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ ڈیڈی نے پورے سکون سے سارے واقعہ کو سنا، اس کے بعد اس مزدور کی فیملی کو بلایا اور ان کے لائق جو کچھ بھی ہوسکتا تھا، وہ ساری ضرورتیں ان کی پوری کیں۔ فیملی پوری طرح مطمئن ہوگئی اور اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

کام کرنے کا یہ طریقہ، جہاں ایک زندگی کے زیاں پر اس کا صحیح معاوضہ ادا کر دیا جائے، واقعی میں قابل تعریف تھا۔ میں نے اس قسم کے سنگین حادثہ کا اتنا دانشمندانہ حل پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ اتنی اہم جگہ پر ذاکر باغ کو جب یہ زمین الاٹ کی گئی، تو اس وقت جگ موہن صاحب ڈی ڈی اے کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے ایک آدمی کو جگہ کا معائنہ کرنے کے لیے بھیجا۔ ڈیڈی گھر کے باہر نالے کو صاف کر رہے تھے۔ انھوں نے حالات کو

بھانپ لیا اور نہایت ہوشیاری سے اُس آدمی سے پیش آئے، جو بڑی چالاکی سے انھیں ڈھونڈنے کے بعد انھیں وہاں سے اٹھانا چاہتا تھا، تاکہ ان کے اس مشن کو ناکام کر سکے۔

میں بچپن میں بہت ضدی تھا اور ان کے لیے پریشانیاں کھڑی کر دیا کرتا تھا، اس کے باوجود میں ان کا پیارا لڑکا تھا، جس پر وہ ہمیشہ اپنی مہربانیاں نچھاور کرتے۔ اپنی عمر کے آخری دنوں میں وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اس بینک کا ڈائرکٹر بنوں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ سوشل وَرک کروں۔ اسی لیے وہ مجھے بھی سب سے آگے رکھنا چاہتے تھے۔

ہمارے چینی دورہ کے دوران، میں نے دیکھا کہ وہاں کے سبھی ڈاکٹر اور نرس ان کے اتنے قریب ہو گئے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔ عالمی شہرت یافتہ کریوسرجن ایکسپرٹ، ہاسپٹل ہیڈ اور ڈاکٹر نون ..... سبھی ان کے آپریشن کے دوران وہاں موجود تھے۔ یہ ڈیڈی کی خوش اخلاقی ہی تھی، جس نے سب کو ایک ساتھ جمع کر دیا تھا۔ چین میں جب انھیں پوری طرح آرام کرنے کی صلاح دی گئی، تو انھوں نے اپنی جلد پر کریم لگانے اور تروتازہ ہونے کی اجازت طلب کی۔

مشکل سے مشکل حالات کو قابو میں کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، تاکہ کمزور طبقوں کو بااختیار بنانے کے عمل کو آسان بنایا جا سکے۔ ان کا واحد مقصد اُن چھوٹے لوگوں کی مدد کرنا تھا، جنھیں قلیل مدت کے لیے مخالف حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوتا۔

ان کا عقیدہ تھوڑا الگ ہٹ کر تھا۔ وہ عبادت تو کرتے تھے، لیکن رسمی طور پر نہیں۔ شدت سے عبادت کرنے کے بجائے، انھوں نے بے سہارا اور کمزور لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ترجیحی طور پر یہی ماڈل اپنایا کہ 'انسانوں کی خدمت کرنا، خدا کی خدمت کرنا ہے'۔

میں حال ہی میں ایک صاحب سے ملا، جنھوں نے مجھے بتایا کہ ڈیڈی ہر مہینے ان کے بچوں کی فیس کے لیے 8 ہزار روپے دیا کرتے تھے۔

ان کے کام کرنے کا طریقہ بالکل الگ تھا۔ اگر کوئی کھانے پینے کا شوقین ہوتا، تو ڈیڈی اس کے لیے اسپیشل کھانے کا انتظام کرتے۔ ان کا برتاؤ اتنا نرم اور مشفقانہ ہوتا کہ زیادہ تر معاملوں میں یہی ہوتا تھا کہ کوئی ان سے 'نہ' نہیں کہتا تھا۔

انھوں نے مجھے سوشل ورک دل سے سکھایا۔ اگر مجھے کہیں بھی سوشل ورک کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی، تو میں اسے کرنے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ سوشل ورک میرے خون میں بہتا ہے۔

ماں ہر چیز کا خیال رکھتی تھیں- ایک سنگل روم میں چیزوں کو درست کرنا، برسات کے دنوں میں بارش کے پانی کو اندر آنے سے روکنا اور اسی قسم کے دیگر حالات کا سامنا کرنا، سماجی ضروریات پوری کرنے پڑوسیوں کے گھر جانا، ٹیچرس سے ملنے اسکول جانا، اسکول میں داخلے کا انتظام کرنا اور اس قسم کی اور بھی بہت سی چیزیں۔

ڈیڈی اپنے کاموں میں اتنے مگن رہتے کہ انھیں اس کام کے پورا کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کی پروا ہی نہ ہوتی۔ ان کا صرف ایک ہی پوائنٹ کا ایجنڈہ تھا- رات اور دن، چوبیسوں گھنٹے کام، کام اور صرف کام، اور وہ بھی دوسروں کے لیے۔

میرا ماننا ہے کہ اگر ڈیڈی ایک منکسر مزاج شخصیت کے مالک اور سنجیدہ سوشل ورکر نہیں ہوتے، تو ہمیں وہ آسانیاں دستیاب نہ ہوتیں، جو آج ہمیں میسر ہیں۔ وہ کافی مزاحیہ اور خوش مزاج تھے، جس کی وجہ سے ہمیں مشکل وقتوں کا سامنا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری تربیت اس دنیا اور یہاں کے بعد والی دنیا، دونوں کے حساب سے کی۔

اللہ انھیں اپنے سایہ تلے رکھے!

آمین!

صدف ظفر بیگ

خدی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

ڈیڈی کا کارنامہ ہر دن چائے کے وقت کا ہمارا موضوع تھا۔ مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے اسکول میں ان پر پہلا مضمون لکھا۔ مجھے اس بات کی حیرانی تھی کہ ایک آدمی وہ سب کچھ کیسے کرسکتا ہے، جس کے بارے میں اسے کوئی جانکاری نہ ہو، کتے کی گندگی سے لے کر نالے کی صفائی تک ..... یہ سب کرنے میں انھیں ذرا بھی گھن نہیں آتی۔ یہ میرے بچپن کی چند یادیں ہیں۔

میں فرینک اینتھونی اسکول گئی، لیڈی شری رام کالج میں پڑھائی کی، یوروپ سے ایچ آر اور انٹرنیشنل بزنس میں ایم بی اے کیا۔

میں اردو بالکل نہیں جانتی تھی۔ میں جب یہاں آئی، تو پہلی بار اردو کا اخبار دیکھا۔ وہ اردو شاعری زور سے پڑھ کر سنایا کرتے، جس کی طرف میں راغب ہوجایا کرتی۔ آہستہ آہستہ اردو میں

میری دلچسپی بڑھنے لگی اور میں اس سے کافی محظوظ ہونے لگی۔ دراصل، ہم نے اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی مدد کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

میں ان معنوں میں بڑی خوش قسمت تھی کہ ان کے ساتھ میں نے دوستانہ رشتے استوار کیے۔ وہ مجھ سے ہر چیز شیئر کیا کرتے تھے۔ وہ ہر کسی سے برابری اور دیانت داری سے ملا کرتے۔ انھوں نے خود اپنے اعمال کے ذریعہ ہمیں دوسروں کی مدد کرنا، اپنے اندر عاجزی پیدا کرنا اور آگے کے لیے مثبت سوچ رکھنا سکھایا۔

ہم نے جب رضا زکوۃ فاؤنڈیشن کھولا، تو وہ بہت خوش تھے اور اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ ''تم نے ایک ادارہ کھول کر بہت بڑا کام کیا ہے۔''

میں نے ان سے مسائل پیدا کرنے کی بجائے، مسائل کا حل نکالنا سیکھا۔ وہ کسی بھی قسم کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتے تھے، جو کہ ان کی نہایت اہم خوبی تھی۔ انھوں نے مجھے کھل کر بات کرنا سکھایا، تاکہ مسئلہ کا حل ڈھونڈ کر اس معاملے کو ختم کیا جا سکے۔ بہوؤں کے طور پر، ہم نے ان کی طرف سے خاص آسانیاں اور پوری نگہداشت حاصل کی، جو کہ کسی گھر میں مشکل سے ہی ملتی ہے۔

وہ اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھے کہ فضول خرچی کسی بھی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے ایک ویب سائٹ کے بارے میں مشورہ دیا، لیکن انھیں وہ پسند نہیں آیا۔ میں نے وجہ بیان کی اور اس کی ضرورت کے بارے میں انھیں تفصیل سے بتایا۔ آخر کار انھوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تعریف کی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شام کو چہل قدمی کے لیے باہر چلے جاتے اور ساڑھے نو بجے تک واپس لوٹتے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ ظفر کے لیے اسپیشل چائے بنایا کرتے اور پھر ہم سارے لوگ ایک ساتھ بیٹھتے۔ وہ مجھ سے دن بھر کی باتیں شیئر کیا کرتے تھے۔

جب میری شادی ہوئی، تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے میرا تعارف کرایا کہ انھیں بیرونِ ملک سے تعلیم یافتہ بہو ملی ہے۔ وہ ہمیشہ خواتین کو آگے آ کر قیادت کرنے کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے، ''خود کو بااختیار بنانا سیکھو، اسمارٹ بنو اور اپنے ظاہر پر دھیان دو۔''

ایسا بھی وقت آتا، جب ان کی بیوی بالکل اکیلی ہوتیں (جب انھوں نے اپنا پورا وقت ذاکر باغ سوسائٹی بنانے میں لگا دیا تھا)، تب انھیں مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس کے باوجود انھوں نے حالات کو حسن اسلوبی سے قابو میں کیا۔ ان کا حوصلہ اور قربانی واقعی میں قابل تعریف ہے۔

میں ایک کھلی ہوئی انسان ہوں۔ بڑا دل رکھتی ہوں۔ میں کافی خوش قسمت ہوں کہ اس گھر میں میری شادی ہوئی، جو مجھے سمجھتے ہیں اور میری پوری حمایت کرتے ہیں۔ ڈیڈی کے بغیر میں اپنے آپ کو ادھوری سمجھتی ہوں۔ میری زندگی میں وہ ایک نہایت اہم انسان تھے اور میری کامیابی، سکون اور خوشی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہمیں ان کی کمی کافی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ ہر مسئلہ کو لے کر ہم ان کے پاس پہنچ جاتے اور اس پر ان سے تفصیلی بات چیت کرتے تھے۔

مجھے نہیں لگتا ہے کہ میں دوبارہ کسی ایسے انسان سے مل پاؤں گی، جو اتنا سخی اور ضرورت مندوں کا اتنا مددگار ہو۔ میں ان کے اس جذبے کو سلام کرتی ہوں اور اللہ سے ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرتی ہوں.....

آمین!!!

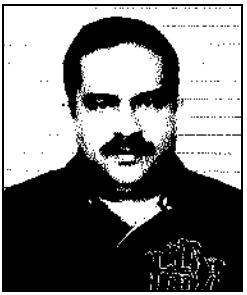

مرزا احمر بیگ

ڈیڈی کا زیادہ تر وقت صرف سوشل ورک میں گزرتا۔ انھوں نے ہماری دیکھ بھال کی، لیکن ہمارے ناجائز مطالبات کو کبھی پورا نہیں کیا۔ کام کرتے ہوئے لوگوں سے کیسے نمٹنا ہے، سماج کے، فیملی کے لوگوں سے کیسے برتاؤ کرنا ہے، یہ ساری چیزیں انھوں نے ہمیں سکھائیں۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ایک بامعنی زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔ انھوں نے ہمیں ایک مقصد اور سمت عطا کی، اور اس کے بعد ہمیں اس بات کی اجازت دی کہ انسانی خوبیوں کی بنیاد پر ہم جتنا چاہیں، ترقی کر سکتے ہیں۔

پیسہ کمانا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے برعکس، ان کی نظر میں اہمیت اس بات کی تھی کہ ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں کتنے شفاف، ایماندار اور سنجیدہ ہیں۔ ان کی نظر میں پیسہ ایک بائی پروڈکٹ تھا، جو صرف ہماری ضروریات کو پورا کرنے میں مدد کرتا ہے۔ لیکن بنیادی ضروریات سے آگے ہمیں سکون حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے، یہی ان کی بنیادی تشویش تھی۔

میرے لیے وہ ایک مکمل سیکولر، انسانیت نواز تھے اور معاشرہ کے کوئی بیکار آدمی نہیں تھے کہ ان کا

کسی سے جھگڑا نہ ہوا ہو۔ انھوں نے صرف دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے اپنی زندگی بسر کی۔ دوسروں کا احترام کرنا اور مدد کے لیے ہاتھ بڑھانا، یہی وہ بنیادی اصول تھے، جن کی انھوں نے ہمیں تعلیم دی۔

اپنی پڑھائی کے ابتدائی ایام میں، بعض دفعہ میں اندر سے خود کو پوری طرح کھوکھلا پاتا۔ میری خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی تھی، لیکن ڈیڈی نے مجھے سکھایا کہ اسے گزر جانے دو۔ آہستہ آہستہ مجھے ان کی یہ بات سمجھ میں آنے لگی اور میں اندر سے مطمئن رہنے لگا اور اخیر میں اپنی زندگی کے لیے بھی میں نے یہی پالیسی اپنائی۔

ہم آج جو کچھ بھی ہیں، یہ سب ڈیڈی کے اچھے برتاؤ اور قدروں کی وجہ سے ہے۔ ان کا سوشل ورک، بزرگوں کی خدمت اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا..... یہ تمام چیزیں ہمارے لیے نعمت ہیں، جو آج ہمارے لیے ہر طرح سے فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں۔ وہ پوری زندگی اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے کہ وہ جو کچھ بھی کھا رہے ہیں، وہی چیزیں دوسروں کو بھی کھانے کے لیے ملنی چاہئیں۔ انھوں نے غریب و امیر میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ وہ ہمیں جوش دلاتے، متحرک کرتے اور ہمارے اندر اتنا حوصلہ بھر دیتے کہ ہم جب بھی باہر کوئی کام کرتے، ہمیں اس کام کو کرنے میں بڑا مزہ آتا۔ انھوں نے ہمیں امن پسند ہونا سکھایا۔

ہم ذاکر باغ میں ہاؤس نمبر 33 میں رہتے تھے۔ اس میں مزید جگہ بنانے کے لیے، میں نے چھت کے آگے کی جگہ کو گھیر لیا، تاکہ ہمارے گھر کو مزید پردے کی جگہ مل جائے۔ ڈیڈی نے کہا کہ جو لوگ ناجائز قبضہ کرتے ہیں یا یہ سوچتے ہیں کہ کرایہ کا گھر ان کا اپنا ہے یا اپنی خواہشوں کو محدود جگہ کے اندر ہی پورا کرتے ہیں اور نہ تو بڑا سوچتے ہیں اور نہ ہی اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، ایسے لوگ چھوٹی جگہ کے اندر ہی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سبق کو حاصل کرنے کے بعد میں نے یہ کیا کہ میں کرایہ کے ایک مکان میں شفٹ ہو گیا۔ میں نے بڑا سوچنا شروع کر دیا، کڑی محنت کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے میرے رزق میں اضافہ کر دیا اور سماج میں میرا مقام بلند کر دیا۔

اللہ ان کی دلی تمناؤں کو پورا کرے!

آمین!

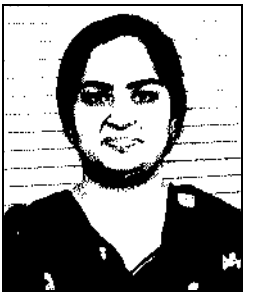

سنبل احمر بیگ

ہاؤس میکر، 1998 میں شادی ہوئی

میرا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ ڈیڈی میرے سسر تھے، لیکن اس سے پہلے وہ میرے خالو تھے۔ ڈیڈی جب بھی علی گڑھ آتے، ہم لوگوں کے لیے عید ہو جاتی۔ وہ ہمیں اچھا کھانا کھلانے اور خوبصورت جگہیں دکھانے کے لیے باہر لے جاتے۔ کئی بار، جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات کرنے جاتے، تو میں بھی ان کے ساتھ جاتی اور تمام قسم کی ضیافتوں سے لطف اندوز ہوتی۔

انھوں نے ہمیں صبر و تحمل کرنا سکھایا۔ یہ بالکل وہی بات ہے، جو گاندھی جی نے کہی تھی کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے، تو اسے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ عام طور پر لوگ اس قسم کے حالات میں سخت ردِعمل کرتے ہیں، لیکن میرا ماننا ہے کہ قصوروار کو معاف کر دینا سب سے بڑی طاقت ہے۔ جواب دینا تو آسان ہے، لیکن جواب نہ دے کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا بہادری ہے۔

میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ آخرت میں انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے۔

آمین!

نشاط گپتا

''میری پہلی انجینئر بٹیا''، ان کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ان کی سادہ مسکان اوران کی باوقار شخصیت کو یاد کر کے اب بھی میرا گلا بھر آتا ہے۔ دنیا کے لیے میرے ڈیڈی انسانیت نواز، ایک سوشل ورکر تھے، لیکن میرے لیے ڈیڈی میرا حوصلہ تھے، میرے بہترین دوست تھے، میرے استاد تھے اور سب سے بڑھ کر میرے ہیرو تھے۔

ان کا جسم جو کبھی کافی متحرک رہا کرتا تھا، ان کی خوشبو پورے کمرے کو معطر کر دیتی تھی، اب وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔ ''یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے'' ان کی آواز اتنی کمزور اور دماغ اتنا مضبوط تھا، لیکن اُس وقت میری پوری دنیا تھم گئی۔ میں جانتی تھی کہ میں ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دوں گی۔ لیکن کافی دیر ہو چکی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

ایک معصوم چھوٹی سی لڑکی، میں بھی ڈیڈی کی طرح ہی بننا چاہتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک بار عید الاضحیٰ کے دن بٹلہ ہاؤس کا ہمارا مکان سیلاب میں ڈوب گیا۔ اس مشکل گھڑی میں بھی ڈیڈی کی فکر صرف یہی تھی کہ کیسے ذاکر باغ کے کاغذات کو بچایا جائے، تاکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے رہائش کے مسئلہ کو حل کر سکیں۔ ہمارے پڑوسی شمشیر علی خان کی مدد سے، ڈیڈی نے تمام کاغذات اکٹھا کرنے شروع کر دیے۔ اس نے میرے اندر اپنی فیملی کو بچانے کا جذبہ پیدا کیا۔ میں نور نگر میں واقع اپنے چچیرے بھائیوں کے گھر سے نکل آئی، جہاں سیلاب کی وجہ سے ہم تھوڑے دنوں کے لیے شفٹ ہوئے تھے اور اپنے گھر جا کر اسے صاف کرنے لگی۔ میں نے جتنا سوچا تھا، اس سے کہیں زیادہ مشکل یہ کام تھا۔ میں دن بھر گھر میں گھس چکے پانی، کیچڑ اور گندگی کو ہاتھ سے نکال کر باہر پھینکتی رہی، تاکہ وہ گھر پھر سے رہنے لائق ہو جائے۔ واپس جا کر میں اس بہادری بھرے کام کے بارے میں ڈیڈی کو بتانا چاہتی تھی، لیکن جیسے ہی دیر سے گھر پہنچی، ممی نے زوردار طمانچہ لگا دیا۔ ڈیڈی غصے سے بھر گئے، کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ پہلے سوچو پھر عمل کرو۔

میرے ڈیڈی نے ہمیشہ اور ہر طرح سے میری مدد کی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے چونکہ میں پہلی انجینئر گریجویٹ تھی، اس پر میرے ڈیڈی کو بہت ناز تھا۔

میں نے جب پہلی بار ایڈمیشن ڈپارٹمنٹ سے رابطہ کیا، تو وہاں سے لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھے ایڈمیشن دینے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن، چونکہ میں نے اپنے ڈیڈی کو ذاکر باغ میں بہت سے کنبوں کو پناہ فراہم کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس لیے اس سے متاثر ہو کر میں ایک سول انجینئر بننا چاہتی تھی۔ لہٰذا، میں اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔ ڈیڈی کی بے پناہ حمایت سے مجھے آخر کار ایڈمیشن مل گیا۔ چاہے وہ فارم بھرنے کا معاملہ ہو، لمبی لائنوں میں کھڑے رہنے کی بات ہو اور ان سب سے مشکل، سماج کا سامنے کرنے کا معاملہ رہا ہو، میرے ڈیڈی نے میری صلاحیتوں پر کبھی شک نہیں کیا۔

والد کے ساتھ میرا جو رشتہ تھا، اسے بدلا نہیں جا سکتا؛ میں نہیں سمجھتی کہ ان سے میں جتنا پیار کرتی تھی، اسے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ میرے والد تھے، بلکہ اس لیے کہ میں

جب بھی شکوک وشبہات میں گھری ہوتی، جب بھی میرے ساتھ کچھ برا ہوتا، وہ ہمیشہ میرے لیے موجود ہوتے، اور میں جانتی ہوں کہ اب بھی وہ ایسا ہی کریں گے۔

میرے والد کی خوبیاں اور خامیاں، سب کی سب سادگی اور حقیقت کا نمونہ تھیں، اور مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میں مرزا فرید الحسن بیگ کی بیٹی ہوں۔

میں ان کی وراثت کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کروں گی۔ ڈیڈی کی کمی مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔

ڈیڈی کی شخصیت اور ان کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے میں اپنے بچوں کو درج ذیل اشعار سناتی ہوں:

سکھایا جس نے ہنر پیار کا زمانے سے
میرا وہ رہنما اٹھ کے گیا سرہانے سے
نہ جانے کتنے چراغوں کو روشنی دے کر
وہ آفتابِ اعظمی گیا زمانے سے
درد دل میں سنجوتا تھا وہ درد مندوں کا
خلاف تھا وہ کسی کا بھی دل دُکھانے سے
وہ فرشتۂ امن و پیار سب سے کہتا تھا
کچھ بھی حاصل نہ ہوگا نفرتیں بڑھانے سے
یہ اُن کا خواب تھا بیٹیاں ہوں تعلیم شدہ
کوئی بھی گھر نہ چھوٹے بیٹیاں پڑھانے سے
بنیں گی ڈاکٹر، انجینئر اگر بیٹیاں
فخر کی بات ہے، وہ ہوگی جس گھرانے سے

وہ فقیرانہ طبیعت ملنگ جیسا تھا
جو دولتیں ہی لٹاتا رہا خزانے سے
نیک لوگوں کی خدا کو بھی ضرورت ہوگی
تبھی تو لے گیا نانا کو وہ بہانے سے

ششانک گپتا

ڈائرکٹر - این ایس ایسوسی ایٹس

ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے، کبھی جوک سناتے ہوئے، کبھی رومانٹک شعر پڑھتے ہوئے اور کبھی قہقہہ لگاتے ہوئے۔

میرے لیے، وہ میرے سسر تھے، لیکن اس رشتہ سے زیادہ، وہ اتنے اچھے انسان تھے کہ میں نے ایسا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

آخری بار ان کا دیدار کرنے کے لیے جتنا بڑا مجمع اکٹھا ہوا، اسے دیکھ کر میری آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اتنے جذباتی لوگوں کا مجمع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، جن میں سے ہر کوئی یہ یاد کرتے ہوئے آہ و بکا کرنے میں لگا ہوا تھا کہ مرزا صاحب کیسے اس کی زندگی میں آئے اور پھر اس کی پوری زندگی کو ہی بدل کر رکھ دیا۔

مجھے بھی ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے، میں بھگوان سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرزا صاحب کو اپنے یہاں اچھی سے اچھی جگہ عطا کرے۔

صبا خان

مرزا فرید الحسن بیگ کی چھوٹی صاحبزادی، صبا خان نے اپنے جذبات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا، ''میں بعض اسپیشل خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوئی۔ میرا برتاؤ، زبان اور اظہار دوسروں کے لیے چنوتی بھرا تھا۔ ڈیڈی نے اسے پہچانا اور مجھے مزید اسپیشل بنا دیا۔ ڈیڈی اور امی کی خصوصی حفاظت و نگہداشت میں، مجھے عزت و وقار کے ساتھ دنیا کا سامنا کرنے کی تربیت ملی۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ڈیڈی گھر کے باہر کے لوگوں کے لیے زیادہ دستیاب رہتے اور جو دوسروں کی مدد کرتے ہوئے ہی زندگی کی ہر سانس لیتے تھے، لیکن انھوں نے ایک والد کے طور پر بھی اپنی ساری ذمہ داریاں پوری کیں۔ وہ ایک سوسائٹی میکر تھے، جب کہ میری ماں ایک ہوم میکر تھیں۔ بچپن میں، میں نے انھیں ہر قسم کے کام کرتے ہوئے دیکھا، چاہے وہ نالیوں کی صفائی ہو، کسی غریب کا ساتھ دینا ہو، وہ سب کے ساتھ برابری سے پیش آتے اور کبھی بھی اپنے طبقہ، حیثیت یا مقام کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ وہ کسی

بچے سے بھی اسی طرح ملتے، جس طرح وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملتے تھے۔ اپنے متعدد کاموں اور ملنسار رویے سے، ڈیڈی نے ہم کو بھی عاجزی، انکساری اور خوش مزاجی سکھائی۔ وہ تمام عمر مالی طور پر کمزور اور پس ماندہ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ لانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔''

شاہد خان

مرزا فرید الحسن بیگ کے چھوٹے داماد، شاہد خان کہتے ہیں، ''میرے پاس یہ بتانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں کہ مرزا فرید الحسن بیگ کیا اور کون تھے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ ایک عظیم انسان تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی غریبوں اور پچھڑوں کی زندگی بدلنے میں لگا دی۔ دوسروں کے ہمدرد ہونے کے علاوہ، وہ ایک اچھے میزبان بھی تھے اور لذیذ کھانے کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں گھر بنالیا کرتے تھے۔

انھوں نے کئی طریقے سے میری ہمت افزائی کی اور آج میں انھیں کی وجہ سے ایک غصہ ور انسان سے بدل کر ایک اچھا اور دوسروں کا خیال رکھنے والا آدمی بن پایا، جسے اب دوسروں کی فکر پہلے ہوتی ہے۔ میرے اندر عاجزی اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ انسانیت آ گئی ہے۔ میں مرزا صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک اچھا انسان بنا دیا۔''

مرزا فرید الحسن بیگ اپولو ہاسپٹل میں زندگی کے آخری ایام میں علاج کے دوران

زندگی سے آخری جنگ

مرزا فرید الحسن بیگ نے اپنی زندگی کی بہت سی لڑائیوں کو کامیابی سے جیتنے کے بعد کسی کاز کی لڑائی لڑنے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ شطرنج کے ماہر کھلاڑی کی طرح، وہ یہ جانتے تھے کہ کس مہرے کا استعمال کب کرنا ہے اور اپنے مخالف کو شہ مات (شکست) دینے کے لیے کب کھیلنا ہے۔ چاہے وہ ذاکر باغ کالونی بنا کر جنوبی دہلی کے بیچوں بیچ، رہائش کی تمام سہولیات کے ساتھ اور بہترین فطری ماحول میں 204 کنبوں کو بسانے کا معاملہ ہو، یا پھر غریبوں کو ان کی بہتر زندگی کی تلاش اور سر اٹھا کر جینے لائق بنانے میں مدد کرنے کے لیے جامعہ کوآپریٹو بینک بنانے کی بات ہو، یا خاص کر لڑکیوں کو بہتر مستقبل کے لیے تیار کرنے کی خاطر اعظم گڑھ میں تعلیمی اداروں کا قیام ہو، یا پھر اعظم گڑھ کے دیہی علاقوں کے باشندوں کے لیے کمیونٹی ریڈیو قائم کرنے کی بات، جہاں وہ حکومت کے ساتھ اپنے مسائل و تشویشات کے بارے میں بات کر سکیں اور بہتر زندگی جینے کے لیے زیادہ بیدار ہو سکیں، مرزا صاحب نے جو کچھ سوچا، اسے حقیقت کا جامہ پہنا کر ہی دَم لیا۔

لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا، جب انھیں ایک ایسی لڑائی کا سامنا کرنا پڑا، جو انھوں نے پوری شجاعت و دلیری سے لڑا، لیکن اس کے باوجود وہ اس میں پہلے کی طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ اس بار چنوتی بھری یہ لڑائی کسی دشمن یا سماجی مسئلہ کے خلاف نہیں تھی، بلکہ یہ لڑائی بیرونی دشمن سے تھی، جس کی پہچان جگر کے کینسر کے طور پر ہوئی۔

جب وہ اس مرض سے لڑ رہے تھے، تو ان کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں نے سوچا کہ وہ اس بیماری سے باخبر نہیں ہیں، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کے بارے میں پوری طرح باخبر تھے۔ ان کی یہ آگاہی ان کے کام کرنے کے طریقے میں جھلکتی تھی۔ وہ تھوڑا بے چین رہنے لگے۔ لوگوں سے کہنے لگے کہ وہ تیز رفتاری سے کام کریں اور اپنے پرانے طریق کار کی بہ نسبت کاموں کو جلدی مکمل کرنے پر زور دینے لگے۔

مرزا صاحب کے پوتوں میں سے ایک، مرزا ثاقب بیگ کہتے ہیں، ''انھیں جب آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا تھا، تب بھی وہ جامعہ کوآپریٹو بینک کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور اس بات کو لے کر فکر مند تھے کہ سماج کے کمزور طبقوں کو روزگار مہیا کرانے کے لیے وسائل کیسے پیدا کیے جائیں۔ درد کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھے، اس کے باوجود انھوں نے اپنے درد کو چھپانے کی پوری کوشش کی اور ہر وقت اسی کوشش میں لگے رہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے کون سے طور طریقے اپنائے جائیں۔''

مرزا صاحب کی بڑی بیٹی، نشاط گپتا بتاتی ہیں، ''مجھے یاد ہے، اپنے علاج کے دوران ڈیڈی کے کام کرنے کے طریقے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ جلد بازی میں رہتے اور لوگوں سے چاہتے کہ وہ جتنا جلدی ممکن ہو، کام کو مکمل کریں۔ میرے خیال سے وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ان کا یہ مرض مہلک ہو سکتا ہے۔ اسی لیے، وہ رکے ہوئے کاموں کو تیزی سے مکمل کروانا چاہتے تھے۔''

ڈاکٹر یگل مشرا کے مطابق، مرزا صاحب نہ صرف سماجی مسائل کے لیے لڑا کو تھے، بلکہ اپنی مثبت سوچ اور خود کار شخصیت کے سبب اپنے مرض کے خلاف بھی لڑتے رہے۔ ایسکارٹ ہاسپٹل، نئی دہلی کے سینئر ہارٹ اسپیشلسٹ، ڈاکٹر مشرا بتاتے ہیں، ''میں نے دل کے مرض میں مبتلا بے شمار

مریضوں کا علاج کیا ہے، لیکن مرزا صاحب بلاشبہ اپنے مرض کے تئیں بالکل الگ نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا دماغ ہمیشہ انھیں کاموں کی طرف لگا رہتا، جو انھوں نے سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے شروع کیے تھے۔ وہ ایک مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے اور کسی بھی سنگین مسئلہ کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایسے لوگ کافی مشکل سے ملتے ہیں، جنھوں نے دوسروں کے لیے زندگی گزاری ہو۔''

ڈاکٹر مشرا مزید بتاتے ہیں،''ایک بار میں نے ان کی بند شریانوں کا آپریشن کیا۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے،'ڈاکٹر، میرا کیس اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ برائے کرم اس بات کو اپنے ذہن میں رکھئے کہ مجھے ایسے بہت سے کاموں کو مکمل کرنا ہے، جو میں نے غریبوں کے لیے شروع کیا ہے۔' وہ ایک ہنس مکھ انسان تھے اور اپنی خوش مزاجی میں کسی بھی منفی جذبے کو کبھی جگہ نہیں دیتے تھے۔''

سینئر سیاسی کارکن، اتل کمار انجان کہتے ہیں،''مرزا فرید الحسن بیگ کی شخصیت پوری طرح بے داغ تھی اور ان کے اندر ارادے کی پختگی اور جفاکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے جو کچھ سوچا، اس پر عمل کیا اور جو کچھ بنانا چاہا، اسے بنا کر دکھا دیا۔ یہی خوبیاں انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں میں بھی پیدا کیں۔ میں نے اپنے خیالات ببلو بھائی (مرزا قمر الحسن بیگ) کو بتا دیے ہیں اور یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ بیگ صاحب نے جتنی بھی پہل کی ہے اور ادارے بنائے ہیں، میں خود کو ان سب کے ساتھ جوڑنا چاہتا ہوں۔''

انھوں نے مزید کہا کہ''مرزا صاحب کی کہانی ہر میدان میں کامیابی کی کہانی ہے - ایک اسٹوڈنٹ کے طور پر، ایک سماجی کارکن کے طور پر، ایک دور اندیش، سرمایہ کار، انسانیت نواز اور ان سب سے بڑھ کر، ایک اچھے انسان کے طور پر۔ انھوں نے عاجزی وانکساری کا پیغام دیا، سیکولر قدروں کے پابند رہے اور اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ اپنے وسائل سے انسان جو کچھ بھی کر سکتا ہے، اسے کرنا چاہیے۔''

آر این شریواستو کے مطابق، مرزا صاحب صحیح معنوں میں ہمارے معاشرے کے کمزور طبقوں

کے لیے ایک مسیحا تھے۔''ان کے افسوسناک سانحہ ارتحال پر، میں نے بہت سے لوگوں کو مرزا صاحب کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیکھا کہ انھوں نے کیسے ان کی زندگیوں کو بدلنے میں مدد کی۔ان میں سے ایک جیب کترا تھا، جو مرزا صاحب کے پاس بینک لون لینے کے لیے آیا، تاکہ کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر کے ایک اچھی زندگی بسر کر سکے۔ایک دوسرے آدمی نے اپنی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ کیسے اس نے ایک ٹیکسی خریدنے کے لیے قرض لیا اور پھر دھیرے دھیرے اپنی کمائی سے اس نے کئی ٹیکسیاں خرید لیں۔آج، وہ 10 ٹیکسیوں کا مالک ہے اور پوری شان سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

مرزا فرید الحسن بیگ کی یادوں کو اپنی فیملی کے ممبران، دوستوں اور بہی خواہوں کے دلوں میں زندہ رکھنے کے علاوہ، جامعہ کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کی انتظامیہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کارپوریشن گروپ ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ نے حال ہی میں دو اور پہل کی ہے - مرزا صاحب کی زندگی کے اہم واقعات کو، مختلف زبانوں میں، ان کی سوانح عمری کی شکل میں جمع کرنا، اور ذاکر باغ اور ایشور نگر کے بیچ کی سڑک کا نام ان کے نام کی مناسبت سے مرزا فرید الحسن بیگ روڈ رکھنا۔

خصوصی نذرانہ

''نانا جان، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی وراثت کی نگرانی کروں گی۔ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔''

آخری سلام کے طور پر میں نے نانا کی پیشانی کو چوما۔ بطور نذرانہ، میں ان کی خدمت میں یہ الفاظ پیش کرنا چاہتی ہوں، جب کہ ان الفاظ کو ادا کرتے وقت میری آواز روندھی ہوئی ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہے۔

وہ آدمی، جس سے میں نے خود سے بھی زیادہ پیار کیا، آخری بار، جب کہ وہ پوری طرح پیلا پڑ چکا تھا، حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں تھا، اس کے جسم کے ہر ایک حصے کے ساتھ لائف سپورٹ لگا ہوا تھا، وہ آدمی جس کے اندر کبھی اتنا جوش ہوا کرتا تھا کہ وہ پورے کمرے کو روشن کر سکتا تھا، وہ آدمی جسے میں اپنی ہر خواہش کو پورا کرنے والا سمجھتی تھی، وہ آدمی جو میرے انکار کرنے کے باوجود مجھ میں پورا یقین رکھتا تھا، وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی 60 سالوں کی کڑی محنت کی دیکھ بھال کی جائے گی۔ اس نے آخری سانس لی اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ہم سے جدا ہو گیا۔

حالانکہ انھیں میں نے آخری بار دیکھا تھا، لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے ان کو آخری بار محسوس کیا ہو۔ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، پھر بھی میں ان کی موجودگی کو محسوس کرتی ہوں۔ میرے نانا چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے وہ سب چھوڑ گئے، جن سے ہم سبق لے سکتے ہیں۔ انھوں نے کبھی دشمنی میں یقین نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ دوستی کو بڑھاوا دیا۔

یہ میرے نانا کی وراثت ہے، جو وہ ہمارے لیے چھوڑ گئے، تاکہ ہم اسے پڑھیں، محسوس کریں اور اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔

میری خواہش ہے کہ ایک دن میں بھی ان کے جیسا بنوں، کم از کم ان کا آدھا ہی سہی۔ ان کی شخصیت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ سوانح عمری ان کے لیے ایک نذرانہ ہے، لوگوں کو

ان کی شخصیت سے روبرو کرانے کی ایک کوشش ہے۔''

مجھے معلوم ہے، کچھ لوگ یہ سوچیں گے کہ میں آپ کو اس لیے پیار کرتی ہوں، کیوں کہ آپ میری فیملی ہیں۔ لیکن صرف یہی وجہ نہیں ہے، میں آپ سے پیار کرتی ہوں، کیوں کہ آپ کی طاقت مجھے حوصلہ فراہم کرتی ہے۔

میں آپ سے پیار کرتی ہوں، کیوں کہ آپ کی کڑی محنت میرے اندر حرکت پیدا کرتی ہے۔ میں آپ سے پیار کرتی ہوں، کیوں کہ آپ کی موجودگی مجھے راحت دیتی ہے۔ کچھ لوگ اس لیے پیدا ہوتے ہیں، تاکہ کسی کام کو انجام دے سکیں، تبدیلی لاسکیں، انسانوں کو انسانیت کے بارے میں بتا سکیں، لیکن آپ نے یہ سارے کام دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ انجام دیے۔

مجھے آپ کی نواسی ہونے پر بڑا فخر ہے اور آج میں آپ سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی اس انسانیت پر مبنی وراثت کو آگے لے کر جاؤں گی۔

آپ نے مجھ سمیت بے شمار لوگوں کو یہ حوصلہ عطا کیا ہے کہ ایک انسان بھی دنیا کو بدل سکتا ہے۔ آپ نے اپنے کام اور جذبہ ہمدردی سے بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو آسان بنایا ہے۔ آپ نے بے شمار لڑکیوں کے اندر یہ اعتماد پیدا کیا ہے کہ انھیں نہ صرف تعلیم دلوائی جانی چاہیے، بلکہ وہ تعلیم کے میدان میں مہارت بھی حاصل کرسکتی ہیں۔ آپ نے لوگوں کے اندر ایسے وقت میں بھی آرزوئیں اور تمنائیں پیدا کیں، جب ایسا کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ نے مجھے وہ قدریں اور تعلیم عطا کی ہیں، جو میرے اندر ہمیشہ رہیں گی اور کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔

آپ نے مجھے ایک بہتر انسان بنایا ہے، اور اسی لیے میں آپ کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔

کاویا

اعتراف وتشکر

روحانی رہنما، حضرت سید بلال حسین تھانوی

اساتذہ: مرحوم نظیرالدین مینائی، آنجہانی مدن لال شرما، مرحوم اے آر سید، مرحوم محسنی صاحب، مرحوم جلال الدین، سابق پرنسپل پولیٹیکنک، جامعہ ملیہ اسلامیہ

مرحوم خورشید عالم خان، سابق مرکزی وزیر اور گورنر، کرناٹک

اے آر قدوائی، سابق گورنر، بہار اور ہریانہ

مرحوم سید حامد، ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر، سابق وائس چانسلر اے ایم یو، سابق چانسلر جامعہ ہمدرد یونیورسٹی

سلمان خورشید، سابق مرکزی وزیر برائے امورِ خارجہ

محمود الرحمٰن، چیئرمین، بامبے مرکنٹائل بینک، ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پی اے انعامدار، صدر ایم سی ای سوسائٹی، اعظم کیمپس، پونے

راج ریوال، ذاکر باغ کے معروف آرکی ٹیکٹ

مرحوم ڈاکٹر محمد شہیر، ذاکر باغ کے مشہور لینڈ اسکیپ آرکی ٹیکٹ

پدم شری جے دورئی راج، ذاکر باغ کے چیف انجینئر، سابق چیف انجینئر سی پی ڈبلیو ڈی

رحمٰن صاحب، چیف ٹاؤن پلانر (کنسلٹینٹ ذاکر باغ)

مہندر راج، ذاکر باغ کے اسٹرکچرا انجینئر

شاہد صدیقی، ایڈیٹر، نئی دنیا ویکلی، سابق رکن پارلیمنٹ

آنجہانی بابو رام کنور سنگھ، فیملی فرینڈ اور سیاسی لیڈر

اتل کمار انجان، قومی سکریٹری، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

آشمہ چودھری، چیئرمین، ساؤتھ دہلی پولیٹیکنک فار ویمن

جسٹس ایس این کمار، سابق جج، دہلی ہائی کورٹ

جسٹس ایم ایس اے صدیقی، سابق چیئرمین، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، حکومت ہند

آنجہانی ڈاکٹر آر جے چیلیا، ہندوستان میں ٹیکس رِفارم کے بانی، جامعہ کوآپریٹو بینک کے بانی چیئرمین

آنجہانی آئی زیڈ بھٹی، سابق چیئرمین، این سی اے ای آر اور جامعہ کوآپریٹو بینک

آنجہانی ایل کے دھون، سابق چیئرمین، جامعہ کوآپریٹو بینک

ایس آر ہاشم، سابق یو پی ایس سی چیئرمین، سکریٹری جنرل پلاننگ کمیشن، ہندوستانی سفیر برائے قزاخستان، ڈائرکٹر، جامعہ کوآپریٹو بینک (موجودہ)

سراج الدین قریشی، صدر آئی آئی سی سی، ڈائرکٹر، جامعہ کوآپریٹو بینک (موجودہ)

ڈاکٹر ایس فاروق، چیئرمین سی آئی آئی اتراکھنڈ اسٹیٹ کونسل، سابق ڈائرکٹر جامعہ کوآپریٹو بینک

جے سی بی کے سابق ڈائرکٹرس: آنجہانی ملہوترا صاحب، آنجہانی رام ناتھ جی، مرحوم ایس ٹی حسن، سراج احمد

جے سی بی کے موجودہ ڈائرکٹرس: پروفیسر جاوید حسین، راجیش گپتا، سریش کمار

حبیب اے فقیہ، سابق ایگزیکٹو نائب صدر اے ایم ای ایف

مرحوم مقصود عالم، چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ، سابق وائس چیئرمین، جامعہ کوآپریٹو بینک

چودھری رگھوناتھ سنگھ، مرزا فرید الحسن بیگ کے کالج کے ساتھی

جے ایس سانگوان، ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور کالج فرینڈ

پرویز ہاشمی، رکن پارلیمنٹ راجیہ سبھا

سبھاش چوپڑا، سابق ایم ایل اے، کالکا جی، نئی دہلی

پروفیسر اسد علی، سابق چیئرمین، جامعہ کوآپریٹو بینک

پروفیسر ابن کنول، صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

حافظ بدرالدین، سابق پرنسپل پولیٹکنک، جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر این یو خان، سابق ڈین، فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر اختر الواسع، قومی کمشنر، ہندوستان کی لسانیاتی اقلیتیں، حکومت ہند

شمیم جے راج پوری، بانی اور سابق وائس چانسلر، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی

انجینئر احمد سعید، سابق وائس چیئرمین، جامعہ کوآپریٹو بینک، ڈائرکٹر (موجودہ)

رامیشور ناتھ سریواستو، سابق چیئرمین، سنٹرل الیکٹری سٹی اتھارٹی، وائس چیئرمین، جامعہ کوآپریٹو بینک (موجودہ)

مرحوم شمشیر علی خان، شاگرد

مرحوم اصغر احسن اصلاحی، اسکول ٹیچر

مرزا محفوظ بیگ، چھوٹے بھائی، سابق پرنسپل مولانا آزاد انٹر کالج؛ چیئرمین، جے پی ایس، اعظم گڑھ؛ چیئرمین، شبلی انٹر کالج، اعظم گڑھ

مرزا عارف بیگ، منیجر، مرزا احسان اللہ بیگ گرلز ڈگری کالج، مولانا آزاد انٹر کالج، رفیع احمد قدوائی گرلز انٹر کالج

شہناز حسین، سی ای او، شہناز ہربل

ڈاکٹر پشپ بھارگو، سابق اے جی ایم، آر بی آئی

ریحانہ مشرا، ڈاکٹر ذاکر حسین کی پوتی، ڈائرکٹر، جامعہ کوآپریٹو بینک

نیلوفر مینن، ڈاکٹر ذاکر حسین کی پوتی

زرینہ بھٹی، ماہر اقتصادیات آئی زیڈ بھٹی کی بیوی

ڈاکٹر شبستاں غفار، سابق چیئرپرسن برائے تعلیم نسواں، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، حکومت ہند

ڈاکٹر فیض وارث، سابق جنرل منیجر، انڈین آئل کارپوریشن؛ ڈائرکٹر جامعہ کوآپریٹو بینک

اندو وَرما، کونسلر، ایم سی ڈی

نشاط فاروق، سابق ڈائرکٹر، جامعہ کوآپریٹو بینک

مرزا اشتیاق بیگ، سابق چیئرمین، سنٹرل الیکٹری سٹی اتھارٹی

مرحوم مرزا انصار بیگ، دوست

دیوندر راوت، ڈائرکٹر این ایس ایسوسی ایٹس پرائیویٹ لمیٹڈ

راکیش تیواری، صلاح کار، تعلیمی ادارے، اعظم گڑھ

مرحومہ قمر النساء، مرزا فرید الحسن بیگ کی ہمشیرہ

پروفیسر ازدالدین خان، بہنوئی

فخر عالم اعظمی اور وقار عالم اعظمی، بہنوئی

ابو صالح (صلو پانڈے)، معروف ماہر تعلیم، مرزا فرید الحسن بیگ کے بھانجے

مرحوم رسول خان، انڈین ایئر فورس آفیسر

نظام الدین اعظمی، چچیرے بھائی اور دوست

حاجی محمد امین، مرزا فرید الحسن بیگ کے چچا

ایڈووکیٹ طارق صدیقی، فیملی فرینڈ اور وکیل، دہلی ہائی کورٹ

سمدھی اور سمدھن: محمد عقیل فاروقی، محترمہ انورادھا گپتا، پروفیسر ازدالدین خان، محترمہ ریحانہ پروین، محترمہ رئیسہ خان، جناب ارشاد احمد

دوست: مرحوم محمد احمد دلکش، مرحوم رضاء الحسن، مرحوم راشد نعمانی، مرحوم اختر علی ظہیر رضوی (گاما بھائی)، آنجہانی اوہری صاحب، آنجہانی بنسل صاحب، آنجہانی بجاج صاحب، چیتن شرما، اشوک شرما، ڈاکٹر شکیل، مرحوم علی حسن افروز، متین امروہی، ہمایوں صاحب، مسلم صاحب، محمود ہاشمی، ظفر محمود، شمیم حنفی، شبیہ الحسن، مقیط خان، عاصم قدوائی، اویس قدوائی، شفیق صاحب

بہی خواہان: مرحوم عبدالستار گرو، مرحوم ڈاکٹر عبدالاحد گرو، عبدالرحیم گرو، راشد گرو، ڈاکٹر خورشید، خالد گرو، وسیم غازی، ایف ایم صدیقی، مجتبیٰ نقوی، محمد ساجد، وقار صدیقی، رضی خان، منصور خان، حارث الحق، محمد الیاس، مسعود خان، شیلیش گپتا، مطیع الرحمٰن، محترم جامی

مرحوم فاروق صاحب، اسکول ٹیچر، جامعہ ملیہ اسلامیہ
حاجی نذیر احمد، سابق جنرل منیجر، سپر بازار

پڑوسی: مرحومہ ثریا بیگم، مرحوم مستری سعید، پروفیسر ماجد حسین، مرحوم حشمت علی، عثمان صاحب، مرحوم محبت علی، محترمہ عبود زیدی، رشید الواحدی صاحب، مرحوم خضر برنی، مرحوم احسان الحق، مرحوم مستری سعید، مرحوم محترمہ حکیمنی، مرحوم محبوب الرحمٰن فاروقی، مرحوم قمر فرشوری، کھورانہ صاحب

ڈاکٹرس: مرحوم ڈاکٹر رحمٰن، ڈاکٹر آر کے ترویدی، ڈاکٹر سمیر شریواستو، ڈاکٹر شیوانی کمار، ڈاکٹر یگل مشرا، ڈاکٹر شاہد، ڈاکٹر ہرش دُوا، ڈاکٹر اسماء، ڈاکٹر سنجے راجپال

خادم: مڑھئی بابا، عتیق احمد، مادھوری، شیلا، راج وتی، سعیدن